تحریر کلیش۔ سید شمس الاسلام دربھنگری
تسلم = درتکمیل ارب دارالعلوم دیوبند

بابت سال ۱۴۱۵ھ

پہلا محاضرہ علمیہ

بر موضوع

رد غیر مقلدیت

پیش کردہ

جناب مولانا محمد راشد صاحب اعظمی

استاذ فقہ دارالعلوم دیوبند

فہرست مضامین

ہندوستان میں تحریک اہلِ حدیث کی ابتداء ——— ۳

تحریک اہلِ حدیث کا پس منظر ——— ۷

اہل حدیث نام کب سے شروع ہوا ——— ۱۰

درخواست برائے الاٹمنٹ بنام اہل حدیث ——— ۱۱

برٹش گورنمنٹ کی طرف سے اہل حدیث نام کی الاٹمنٹ ——— ۱۳

کیا ان حضرات کا اہل حدیث نام صحیح ہے ——— ۱۴

پہلے اہل حدیث کن کو کہا جاتا تھا ؟ ——— ۱۸

ان کا مناسب نام کیا ہوگا ؟ ——— ۲۲

مولانا عبدالحق بنارسی ——— ۲۳

نواب صدیق حسن صاحب ——— ۲۴

نواب صاحب اور انگریز ——— ۲۶

مولانا نذیر حسن صاحب دہلوی ——— ۲۹

مولوی نذیر صاحب اور انگریز ——— ۳۰

مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی ——— ۳۱

مولانا محمد حسین صاحب اور انگریز ——— ۳۲

کاتب: محمد نسیم سیتاپوری (شرافت منزل، خانقاہ) دیوبند ۹۲ء

ہندوستان میں تحریکِ اہل حدیث کی ابتداء

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الکریم وعلی آلہ واصحابہ اجمعین :۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کے مطابق کہ تفترق امتی علی ثلث وسبعین ملۃً ، (ترجمہ) میری امت تہتر فرقوں پر تقسیم ہو جائے گی ۔

ہر دور میں اہل حق کے متوازی فرقے پیدا ہوتے رہے انھیں فرقوں میں یہ فرقہ اہل حدیث بھی ہے جس کی ابتدا ہندوستان میں ۱۲۴۶ھ کے بعد ہوئی ۔ اس سے قبل ہندوستان میں اس فرقہ کا نام ونشان تک نہ تھا ۔ مشہور غیر مقلد عالم نواب صدیق حسن صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ :

"خلاصۂ حال ہندوستان کے مسلمانوں کا یہ ہے کہ جب سے یہاں اسلام آیا چونکہ اکثر لوگ بادشاہوں کے طریقے اور مذہب کو پسند کرتے ہیں ۔ اس وقت سے لے کر آج تک یہ لوگ حنفی مذہب پر قائم رہے اور ہیں ۔ اور اسی مذہب کے عالم اور فاضل قاضی اور مفتی اور حاکم ہوتے رہے ہیں" [1]

صاحب مظاہر حق نواب قطب الدین صاحب متوفی ۱۲۸۹ھ اپنے رسالہ تحفۃ العرب والعجم میں تحریر فرماتے ہیں کہ :

"مسکین قطب الدین مسلمان بھائیوں کی خدمات عالیات میں سلام پہنچانے کے

---

[1] ترجمان وہابیہ مصنفہ نواب صدیق صاحب ص۱ ،

بعد حدیث پاک النصح لکل مسلم کے مقتضاء کے مطابق التماس کرتا ہے کہ تخمیناً چالیس بیالیس برس کا عرصہ ہوا کہ حضرت سید احمد شہید بریلوی اور مولانا اسماعیل صاحب اور مولانا عبدالحی صاحب ان حضرات کے ملک پنجاب کی طرف تشریف لے جانے کے بعد بعض مفسدین مزاجوں کے خیال میں ائمہ دین متین کی تقلید کا کچھ انکار آیا تھا اور فقہا اور فقہ کی طرف سے عناد کا تخم بالخصوص جناب حضرت ابوحنیفہؒ کی طرف سے ان کے دل میں جما تھا منجملہ ان لوگوں کے جنھوں نے لامذہبی کی خوب خوب داد دے کر بہت سے مسلمانوں کو حضرت سید احمد شہید کی خلافت کا مدعی بن کر بہکایا، اور فساد و نو احداث مذہب کا پھیلایا تھا مولوی عبدالحق بنارسی تھا۔ سو اس وقت پورب کے دین دار لوگوں نے بالخصوص سید احمد شہید بریلوی کے خلفاء اور مریدوں نے حرمین شریفین کے علماء سے فتویٰ طلب کیے۔ چنانچہ وہاں کے چاروں مذہب کے مفتیوں نے اور وہاں کے تمام دیگر علماء نے، جیسے شیخ عابد سندھی مصنف طوالع الانوار حاشیہ درمختار نے لکھ دیا کہ ایسے لوگ گمراہ اور گمراہ کرنیوالے ہیں اور اس فتوی پر اپنی اپنی مہریں ثبت فرمائیں۔ اس کے بعد اس فتویٰ پر کلکتہ وغیرہ کے تمام علماء نے بالخصوص سید احمد بریلوی کے خلفاء حضرات نے اپنی اپنی مہریں کیں اور ایسے لوگوں کی گمراہی پر اتفاق ہوگیا [1]

حضرت نواب قطب الدین صاحب رح کی اس عبارت سے یہی نتیجہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس فرقہ جدیدہ کی منظم شکل ۱۲۴۶ھ کے بعد ظہور پذیر ہوئی۔ کیوں کہ مولوی عبدالحق صاحب وغیرہ نے حضرت سید صاحبؒ کی خلافت کا دعویٰ کر کے اپنے نظریات کی اشاعت شروع کی تھی اور سید صاحب رح کی شہادت ۱۲۴۶ھ میں ہوئی۔ نیز مولوی عبدالحق صاحب وغیرہ کے خلاف سید صاحب رح کے خلفاء نے علمائے حرمین سے فتویٰ طلب کیا تھا۔ جو یقیناً حضرت سید صاحب رح کی شہادت کے بعد کا واقعہ ہے اور اس کے بعد ہندوستان کے علماء نے بھی اس فرقہ کے خلاف فتویٰ دیا۔

ہندوستانی علماء کا یہ فتویٰ ۱۲۵۴ھ میں شائع ہوا۔ تنبیہ الضالین میں ہے،

---

[1] بحوالہ النجاۃ الکاملہ ص ۲۱۴۔

"۱۲۵۴ھ میں اس فرقہ کے خلاف متعدد علماء نے سخت فتوی دیئے جن میں حضرت شاہ اسحاق صاحب رح دہلوی متوفی ۱۲۶۲ھ، مفتی صدرالدین صاحب رح خاں بہادر دہلوی متوفی ۱۲۸۵ھ، مولانا عبدالخالق صاحب رح متوفی ۱۲۴۷ھ (استاد و خسر مولوی سید نذیر حسین) خاص طور سے قابل ذکر ہیں"۔[1]

نواب قطب الدین صاحب فرماتے ہیں:

"۱۲۵۴ھ ایک ہزار دو سو چون میں ایک استفتاء مولوی اسحاق صاحب نواسہ و جانشین حضرت مولانا عبدالعزیز صاحبؒ کے روبرو پیش کیا گیا، انھوں نے اس کے جواب میں تقلید امام معین کو واجب مجزا اور اس کے منکر کو ضال یعنی گمراہ لکھا پھر اس فتوی پر دیگر علماء شہر نے بھی کچھ عبارتیں لکھ کر اپنی اپنی مہریں ثبت کیں ... پھر یہ فتوی، فتوی حرمین شریفین کے ساتھ جس کا ذکر پہلے آچکا ہے منظم کر کے چھاپا اور اس کا نام ... تنبیہ الضالین رکھا"۔[2]

اسی تنبیہ الضالین میں ہے:

"سو بانی اس فرقۂ احداث کا عبدالحق بنارسی ہے جو چند روز سے بنارس میں رہتا ہے اور حضرت امیرالمومنین (سید احمد شہید) نے ایسی ہی حرکات ناشائستہ کے باعث اپنی جماعت سے اس کو نکال دیا۔ اور علماء حرمین شریفین نے اس کے قتل کا فتوی لکھا اگر کسی طرح وہاں سے بھاگ کر بچ نکلا ..... اپنے تئیں خلیفہ امیرالمومنین کا مشہور کر کے لوگوں کو اپنے عقائد سے بتدریج مطلع کیا"۔[3]

نیز کتاب مذکور میں ہے:

"اگر حضرت امیرالمومنین سید احمد رح اس زمانے میں ہوتے تو ان نئے مذہب والے

---

[1] تنبیہ الضالین ص۳۱، بحوالہ طائفہ منصورہ ص۱۰۔

[2] تحفۃ العرب والعجم بحوالہ النجاۃ الکاملہ ص۱۶ جلد۲۔

[3] تنبیہ الضالین ص۵، بحوالہ انگریز اور اہل حدیث ص۱۷۔

مفسدوں، گمراہوں، غیر مقلدوں کا وہی حال کرتے جو ان کے پیشوا عبدالحق کا کیا تھا یعنی سر دود کہتے اور نکلوا دیتے"۔ [1]

جناب نواب صدیق حسن صاحب، جو غیر مقلدوں کے مایۂ ناز محقق ہیں بلکہ وہ لوگ انہیں اپنے دور کا مجدد قرار دیتے ہیں [2]۔۔۔۔ اپنی مشہور کتاب الحطہ فی ذکر الصحاح الستہ میں تحریر فرماتے ہیں:

"فقد نبت فی هذا الزمان فرقة ذات سمعة ورياء تدّعی لانفسها علم الحديث والقرآن والعمل بهما مع العلات فی كل شان مع انها ليست فی شیء من اهل العلم والعمل والعرفان فيا لله العجب من ان يسمون انفسهم الموحدين والمخلصين وغيرهم بالمشركين وهم اشد الناس تعصبا وغلوا فی الدين" [3]

یہ واضح رہے کہ نواب صاحب کے زمانے تک غیر مقلدین اپنے کو اہلحدیث کے بجائے موحدین ہی کہتے تھے ۔۔۔ اہل حدیث کا لقب تو انھوں نے ۱۸۱۸ء میں اپنے لیے نامزد کرایا۔ اس کی تفصیل نشاء اللہ آگے آئے گی۔

غیر مقلد عالم مولوی محمد شاہ جہانپوری متوفی ۱۳۳۸ھ جن کی کتاب "الارشاد الی سبیل الرشاد" غیر مقلدوں کے یہاں بڑی معرکۃ الآرا کتاب ہے [4] خود اپنے ہی فرقہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"کچھ عرصہ سے ہندوستان میں ایک ایسے غرامانوس مذہب کے لوگ دیکھنے میں آرہے ہیں جس سے بالکل لوگ ناآشنا ہیں۔ پچھلے زمانے ہیں شاذونادر اس خیال کے لوگ کہیں ہوں تو ہوں مگر اس کثرت سے دیکھنے میں نہیں آئے۔ بلکہ ان کا نام بھی ابھی تھوڑے ہی دنوں میں سنا ہے۔ اپنے آپ کو تو وہ اہل حدیث یا محمدی کہتے ہیں مگر مخالف فریق میں ان کا نام غیر مقلد یا وہابی یا لامذہب لیا جاتا ہے"۔ [5]

---

[1] تنبیہ الضالین صفحہ ۹ بحوالہ انگریز اور اہلحدیث:۔

[2] ملاحظہ ہو مقدمہ الحطہ صفحہ ۱:۔

[3] ؍؍ ؍؍ صفحہ ۱۵۳:۔

[4] ملاحظہ ہو تراجم علمائے اہل حدیث ہند صفحہ ۳۷۳:۔

[5] الارشاد الی سبیل الرشاد صفحہ ۱۳:۔

تنبیہ الضالین میں ہے :

" بعضے کم علم لوگوں نے حضرت کی خبر شہادت کے بعد اپنی ناموری اور جاہلوں میں عزت بڑھانے کو اور دین کے پردے میں دنیا کمانے کو ایک گروہ اپنا علیحدہ مقرر کر لینے کو اس دین محمدی میں رخنہ ڈالنا شروع کر دیا۔ سوائے مسلمانوں یہ زمانہ فساد کا ہے اور یہ لوگ آخری زمانہ کے نائب دجال ہیں یعنی باطل کو حق کے ساتھ ملانیوالے ایسے لوگ اس زمانہ میں بہت ظاہر ہوں گے یا یہ اصلاً روافض شیعہ ہیں سنیوں میں چھپے ہوئے دین میں فساد ڈالتے ہیں اور آہستہ آہستہ لوگوں کو بے دین کرتے ہیں ایسوں ہی کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف کے تیرھویں سپارے نویں رکوع فرمایا ہے، الذین ینقضون عہد اللہ من بعد المیثاقہ ویفسدون فی الارض الخ [1]

تحریک اہل حدیث کا پس منظر

دنیا میں خلاف حق تحریکات ونظریات اور فرقے یوں ہی اتفاقاً منصۂ شہود پر ظاہر نہیں ہوا کرتے۔ بلکہ ان کے پس پردہ کچھ عزائم مقاصد مذہبی یا سیاسی جذبات نیز زیر پردہ چھپے ہوئے بعض حضرات کا ت پنہاں ضرور کارفرما ہوتا ہے۔ چنانچہ اس تحریک اہل حدیث کے پس منظر میں کون سے عوامل اس سلسلے میں اسی تحریک ہی کے رکن رکین، مربی وسرپرست جناب نواب صدیق حسن صاحب نواہی شہادت اہل خانہ کے مترادف ہے۔ فرماتے ہیں :

" یہ آزادگی ہماری مذاہب جدیدہ سے (یعنی تحریک اہل حدیث، ناقل) مین مراد قانون انگلشیہ ہے " [2]

ز فرماتے ہیں :

" فرماں روان بھوپال کو ہمیشہ آزادگی مذہب (یعنی عدم تقلید) میں کوشش رہی ہے جو خاص منشا گورنمنٹ انڈیا کا ہے " [3]

---

[1] غیر مقلدین اپنے اکابر کی نظر میں ص ۲۹، [2] ترجمان وہابیہ مصنفہ نواب صاحب، [3] ،، ص ۳۔

اسی تحریک اہل حدیث کی ایک شاخ غرباء اہل حدیث ہے جس کے بارے میں غیر مقلد محمد مبارک صاحب لکھتے ہیں :

"جماعت غرباء اہل حدیث کی بنیاد محدثین کی مخالفت پر رکھی گئی تھی۔ صرف یہی مقصد نہیں بلکہ "تحریک مجاہدین" یعنی سید احمد بریلوی کی تحریک کی مخالفت کرکے انگریز کو خوش کرنے کا مقصد پنہاں تھا"۔[1]

غیر مقلدوں کے شیخ الکل فی الکل میاں نذیر حسین کے شاگرد خاص مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی جو اپنے زمانے میں "وکیل اہل حدیث" کہلاتے تھے۔ بڑے طمطراق سے رقم طراز ہیں کہ :

"اس گروہ اہل حدیث کے خیر خواہ وفادار، رعایا، برٹش گورنمنٹ ہونے پر ایک بڑی روشن اور قوی دلیل ہے کہ یہ لوگ برٹش گورنمنٹ کے زیر حمایت رہنے کو اسلامی سلطنتوں کے زیر سایہ رہنے سے بہتر سمجھتے ہیں"۔[2]

میاں نذیر حسین کے شاگرد رشید مولوی لطف حسین فرماتے ہیں کہ :

"انگریزی گورنمنٹ ہندوستان میں ہم مسلمانوں کے لیے خدا کی رحمت ہے"۔[3]

غیر مقلد عالم مولوی عبدالرحیم عظیم آبادی اپنی کتاب الدر المنثور فی تراجم اہل صادقپور میں لکھتے ہیں کہ :

"خاص کر فرقہ اہل حدیث کے لیے تو کسی اسلامی سلطنت میں بھی یہ آزادی مذہبی نصیب نہیں جو برٹش حکومت میں حاصل ہے"۔[4]

ع ہم ان کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

آئندہ صفحات میں یہ وضاحت آرہی ہے کہ اس فرقے کا اہل حدیث نام بھی انھیں انگریز آقاؤں کا رہین کرم ہے۔ نیز اس فرقے کی تمام مرکزی شخصیات کے حکومت برطانیہ سے خصوصی مراسم بھی اس راز دروں کو واشگاف کرتے ہیں۔ ع

کوئی معشوق ہے اس پردہ زنگاری کا

---

[1] علماء احناف اور تحریک مجاہدین ص۴۵۔
[2] الحیاۃ بعد المات ص۹۳۔
[3] الحیاۃ بعد المات ص۹۳۔
[4] الدر المنثور بحوالہ رسالہ اہل حدیث ص۱۵۔

انگریزی عنایات بیکراں کے مورد خاص ہمیشہ یہی رہے۔

مولوی محمد حسین بٹالوی کو انگریز سے جہاد کرنے کے خلاف رسالہ "الاقتصاد فی مسائل الجہاد" لکھنے پر جاگیر ملی۔

مولانا مسعود عالم ندوی لکھتے ہیں کہ:

"معتبر اور ثقہ راویوں کا بیان ہے کہ اس کے معاوضہ میں سرکار انگریزی سے انھیں جاگیر بھی ملی تھی" [1]

سیرت ثنائی میں ہے کہ:

"اس کتاب پر مولوی محمد حسین بٹالوی انعام سے بھی سرفراز ہوئے۔ جماعت اہلحدیث کو فرقہ کی شکل دینے میں ان کا خاص حصہ ہے اور یہ وہ بزرگ ہیں جنھوں نے اس سادہ لوح فرقہ میں وفاداری کی خوب بو پیدا کی ہے" [2]

حکومت انگلشیہ کی طرف سے خطابات کچھ خاص خدمات کے صلہ ہی میں ملا کرتے تھے جن سے بالعموم یہی حضرات نوازے جاتے تھے۔ حکومت انگریزی کی طرف سے نواب صدیق احمد کی اہلیہ رئیسہ بھوپال کو یہ مژدہ جانفزا ملتا ہے کہ "اس نوید مسرت افزا سے آپ کو اطلاع دی گئی ہے کہ گورنمنٹ انگلشیہ سے دیا جانا خطاب نوابی وخلعت نواب صدیق حسن خاں بہادر شوہر مشفقہ کو منظور ہوا ہے" [3]

مولوی عبدالرحیم عظیم آبادی نے اپنی کتاب "الدر المنثور فی تراجم اہل صادقپور میں" ان غیر مقلد علماء کی فہرست ذکر کی ہے جن کو انگریزی حکومت کی طرف سے شمس العلماء وخان بہادر کا خطاب ملا ہے۔ ایک نظر اس فہرست پہ بھی ڈالتے چلیں۔

شمس العلماء حضرت مولانا محمد سعید قدس سرہٗ ساکن مغل پور شہر پٹنہ۔

شمس العلماء جناب حضرت مولانا محمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ ساکن محلہ صادق پور شہر پٹنہ۔

شمس العلماء برادرم عزیز مولوی عبدالرؤف مرحوم ومغفور ساکن محلہ صادق پور پٹنہ۔

---

[1] ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ص ۲۱۲۔ [3] مآثر صدیقی ص ۹۱ ج ۲۔

[2] سیرت ثنائی ص ۳۷۲ بحوالہ اہل حدیث اور انگریز ص ۸۷۔

شمس العلماء مولوی امجد علی صاحب ایم، اے پروفیسر میور سنٹرل کالج الٰہ آباد ساکن صادق پور (پٹنہ)

شمس العلماء جناب حضرت مولانا نذیر حسین صاحب محدث دہلوی ساکن سورج گڈھ (مونگیر)

مولوی محمد یوسف جعفری (رنجور)

خاں بہادر جناب قاضی سید محمد اجمل صاحب مرحوم ساکن قصبہ باڑہ (پٹنہ)

خاں بہادر جناب قاضی مولوی فرزند احمد صاحب ساکن گیا [1]

یہ صرف ان خطاب یافتہ حضرات کی فہرست ہے جو ایک صوبہ بہار سے تعلق رکھتے تھے

اہل حدیث نام کب سے شروع ہوا

اس فرقے کے لوگ پہلے پہل کسی خاص نام کے ساتھ منسوب نہ تھے، بعد میں یہ لوگ اپنے آپ کو محمدی یا موحد کہنے لگے دوسرے لوگ ان کو وہابی کہتے تھے۔

مولوی اسلم جیراجپوری جو اہل حدیث کے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ لکھتے ہیں:

"پہلے اس جماعت نے اپنا کوئی خاص نام نہیں رکھا تھا۔ مولانا شہید کے بعد جب مخالفوں نے ان کو بدنام کرنے کے لیے وہابی کہنا شروع کیا تو وہ اپنے آپ کو محمدی کہنے لگے۔ پھر اس کو چھوڑ کر اہل حدیث کا لقب اختیار کیا جو آج تک چلا آرہا ہے" [2]

جس طرح بعض دفع بچۂ نومولود کا ابتداءً کچھ نام نہیں رکھا جاتا، چند دن کے بعد کوئی نام رکھ دیا جاتا ہے اسی طرح اس فرقہ کی ابتدا میں اس کا کوئی نام نہیں تھا پھر کچھ دنوں کے بعد محمدی یا موحد کے نام سے موسوم ہوئے۔ پھر مزید دجل و فریب کے خیال سے اپنا نام اہل حدیث رکھ لیا اور باقاعدہ انگریز گورنمنٹ سے اس کی سند اور اجازت بھی حاصل کر لی۔ سچ ہے ؎

شاہد دل رُبائے من می کند از برائے من
نقش و نگار و رنگ و بو لحہ بہ لحہ نو بنو

میاں نذیر حسین صاحب کے خسر مولانا عبدالخالق صاحب۔ المتوفی ۱۲۴۷ھ کے زمانے تک ان

---

[1] الدر المنثور صـ۲ بحوالہ رسائل اہل حدیث صـ۲۲، [2] نوادرات صـ۳۴۲ بحوالہ طائفہ منصورہ صـ۱۰۔

لوگوں نے ابھی اپنا نام اہل حدیث نہیں اختیار کیا تھا بلکہ خود کو محمدی کہتے تھے۔ مولانا لکھتے ہیں:

"یہ لوگ اپنے آپ کو محمدی اور دوسرے مذاہب والوں کو ناقص محمدی اور بدعتی کہتے ہیں"[1]۔ نیز لکھتے ہیں:

"لوگوں سے کہتے ہیں کہ ہم محمدی ہیں اور حقیقت میں محمدیوں کے خلاف ہیں"[2]۔

مولوی محمد حسین صاحب نے جو غیر مقلدین کے وکیل اعظم تھے۔ لفظ وھابی کی منسوخی اور اہلحدیث نام کی الاٹمنٹ کے لیے انگریز بہادر کے حضور ایک درخواست پیش کی جس میں انگریز سرکار کیلیے غیر مقلدین کی من حیث الجماعت وفاداری، خیر خواہی اور نمک حلالی کے سلسلے میں اپنی جماعت کی نمایاں خدمات کا ذکر کیا۔ اور متعدد نازک مواقع میں اپنی بہی خواہی کی نشان دہی کی اور اس درخواست کے اخیر میں التجا کی کہ لفظ وھابی کو منسوخ کر کے ہمارے فرقے کے لیے اہل حدیث نام الاٹ کیا جائے۔

ذیل میں اس درخواست کا اردو ترجمہ پیش کیا جاتا ہے تاکہ اس کے مضرات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکے:۔

ترجمہ درخواست برائے الاٹمنٹ بنام اہل حدیث

و منسوخی لفظِ وھابی، اشاعت السنۃ آفس لاہور

از جانب ابو سعید محمد حسین لاہوری۔ ایڈیٹر۔ اشاعت السنہ و وکیل اہل حدیث ہند

"بخدمت جناب سکریٹری گورنمنٹ، میں آپ کی خدمت میں سطورِ ذیل پیش کرنے کی اجازت اور معافی کا خواستگار ہوں۔ ۱۸۸۶ء میں، میں نے ایک مضمون اپنے ماہواری رسالہ اشاعت السنہ میں شائع کیا تھا جس میں اس بات کا اظہار کیا تھا کہ لفظ وہابی جس کو عموماً باغی و نمک حرام کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اس لفظ کا استعمال مسلمانان ہندوستان کے اس گروہ کے حق میں جو اہل حدیث کہلاتے ہیں اور وہ ہمیشہ

---

[1] تنبیہ الضالین ص۳۲ بحوالہ طائفہ منصورہ ص۱۰۱

[2] " " ص۱۳۰ " " "

سے سرکار انگریز کے نمک حلال اور خیر خواہ رہے ہیں اور یہ بات (سرکار کی وفاداری اور نمک حلالی) بارہا ثابت ہو چکی ہے اور سرکاری خط و کتابت میں تسلیم کی جا چکی ہے مناسب نہیں (خط کشیدہ جملے خاص طور پر قابلِ غور ہیں)

بنا بریں اس فرقہ کے لوگ اپنے حق میں اس لفظ کے استعمال پر سخت اعتراض کرتے ہیں اور کمالِ ادب و انکساری کے ساتھ گورنمنٹ سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ (ہماری وفاداری، جانثاری اور نمک حلالی کے پیش نظر) سرکاری طور پر اس لفظِ وہابی کو منسوخ کر کے اس لفظ کے استعمال سے ممانعت کا حکم نافذ کرے اور ان کو اہل حدیث کے نام سے مخاطب کیا جاوے"

اس مضمون کی ایک کاپی بذریعہ عرض داشت میں (محمد حسین بٹالوی) نے پنجاب گورنمنٹ میں پیش کی اور اس میں یہ درخواست کی:

"کہ گورنمنٹ اس مضمون کی طرف توجہ فرماوے اور گورنمنٹ ہند کو بھی اس پر متوجہ فرماوے اور اس فرقے کے حق میں استعمال لفظ وہابی سرکاری خط و کتابت میں موقوف کیا جاوے اور اہل حدیث کے نام سے مخاطب کیا جاوے"۔ اس درخواست کی تائید کے لیے اور اس امر کی تصدیق کے لیے یہ درخواست کل ممبران اہل حدیث پنجاب و ہندوستان کی طرف سے ہے (پنجاب ہندوستان کے تمام غیر مقلد علماء یہ درخواست پیش کرنے میں برابر کے شریک ہیں) اور ایڈیٹر اشاعت السنہ ان سب کی طرف سے وکیل ہے۔ میں (محمد حسین بٹالوی) نے چند قطعات محضر نامہ گورنمنٹ پنجاب میں پیش کیا جن پر فرقہ اہل حدیث تمام صوبہ جات ہندوستان کے دستخط ثبت ہیں اور ان میں اس درخواست کی بڑے زور سے تائید پائی جاتی ہے۔ چنانچہ آنریبل سر چارلس ایچی سن صاحب بہادر جو اس وقت پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر تھے گورنمنٹ کو اس درخواست کی طرف توجہ دلا کر اس درخواست کو باجازت گورنمنٹ ہند منظور فرمائیں اور اس استعمال لفظِ وہابی کی مخالفت اور اجرائے نام اہلحدیث کا حکم پنجاب میں نافذ فرمایا جاوے میں ہوں آپکا نہایت ہی فرمانبردار خادم"، ابوسعید محمد حسین ایڈیٹر اشاعت السنہ

(صفحہ ۲۴ تا صفحہ ۲۶ شمارہ ۲ جلد ۱۱)

برٹش گورنمنٹ کی طرف سے بٹالوی صاحب کو اہل حدیث کے نام کی الاٹمنٹ کی اطلاع

مولوی بٹالوی صاحب نے جماعت اہل حدیث کے وکیل اعظم ہونے کی حیثیت سے حکومت ہند اور مختلف صوبہ جات کے گورنروں کو لفظ وھابی کی منسوخی اور اہل حدیث نام کی الاٹمنٹ کی جو درخواست دی تھی کہ ان کی جماعت کو آئندہ وھابی کے بجائے اہلحدیث کے نام سے پکارا جائے اور سرکاری کاغذات اور خطوط اور مراسلات میں وھابی کے بجائے اہل حدیث لکھا جائے انگریز سرکار کی طرف سے ان کی سابقہ عظیم الشان خدمات اور جلیل القدر کارناموں کے پیش نظر اس درخواست کو گورنمنٹ برطانیہ نے باقاعدہ منظور کر کے لفظ وہابی کی منسوخی اور اہل حدیث کے نام کی الاٹمنٹ کی۔ باضابطہ تحریری اطلاع بٹالوی صاحب کو دی، سب سے پہلے حکومت پنجاب نے اس درخواست کو منظور کیا۔

لیفٹیننٹ گورنمنٹ پنجاب نے بذریعہ سکریٹری حکومت پنجاب مسٹر ڈبلو، ایم، ینگ صاحب بہادر نے بذریعہ چٹھی نمبری ۱۷۵۸ء مجریہ ۳ر دسمبر ۱۸۸۶ء اس کی منظوری کی۔ اطلاع بٹالوی صاحب کو دی۔ اسی طرح گورنمنٹ سی، پی کی طرف سے ۴ر جولائی ۱۸۸۸ء بذریعہ خط نمبری ۴۰۷ گورنمنٹ یوپی کی طرف سے ۲۰ر جولائی ۱۸۸۸ء بذریعہ خط نمبری ۳۸۶ گورنمنٹ بمبئی کی طرف سے ۴ر اگست ۱۸۸۸ء بذریعہ خط نمبری ۳۲۰ گورنمنٹ مدراس کی طرف سے۔ ۱۵ر اگست ۱۸۸۸ء بذریعہ خط نمبری ۱۲۷ گورنمنٹ بنگال کی طرف سے ۴ر مارچ ۱۸۹۰ء بذریعہ خط نمبری ۱۵۶، اس درخواست کی منظوری کی اطلاعات مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی کو فراہم کی گئیں [1]

اسلام کی تاریخ میں کوئی ایسا واقعہ نہیں ملتا کہ کسی مسلم جماعت نے اپنا مذہبی و مسلکی نام کسی غیر مسلم حکومت سے الاٹ کرایا ہو۔ یہ صرف ہندوستان کے غیر مقلدوں ہی کو فخر حاصل ہے کہ برٹش گورنمنٹ سے اپنا نام اہل حدیث منظور کرایا۔

---

[1] اشاعت السنہ شمارہ ۲ جلد ۱۱ صـ۳۲ تا صـ۳۹ ، جنگ آزادی از جناب پروفیسر محمد ایوب صاحب قادری صـ۶۶

اور گورنمنٹ نے بھی سابقہ عظیم خدمات اور وفاداریوں کے صلہ میں اہل حدیث کا وہ نام جو پہلے دین اسلام کے عظیم خادموں کے لیے خاص تھا۔ اپنے ان خادموں کے لیے مخصوص کر دیا۔

ع برعکس نہند نام زنگی کافور

یہاں ایک سوال ذہن میں ابھرتا ہے کہ غیر مقلدوں کو اپنے لیے اہل حدیث نام الاٹ کرانے کی آخر ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس کا ایک سامنے کا جواب تو یہ ہے کہ چونکہ انگریز دشمنوں اور سرفروشوں کو ایک سازش کے تحت وہابی کے نام سے موسوم کر دیا گیا تھا جہاں کوئی انگریز دشمنی کی بات کرتا اسے وہابی کہہ دیا جاتا۔ اب اگر غیر مقلدوں کو بھی وہابی کہا جاتا تو انگریز دشمنی کا توہم ہو سکتا تھا۔ جس سے انگریز کی نمک خواری اور وفاداری میں فرق آنے کا اندیشہ تھا۔

نیز نوازشات کے بجائے داروگیر کے امکانات سامنے آسکتے تھے اس لیے غیر مقلدوں نے گورنمنٹ سے درخواست کر کے اپنا نام اہل حدیث کرالیا۔

اور تبدیلی نام کا دوسرا مقصد یہ تھا کہ اس نام کی عظمت سے فائدہ اٹھا کر عام مسلمان اور سادہ لوح لوگوں کو مغالطہ میں رکھا جائے۔ جیسا کہ اس کی وضاحت انشاء اللہ اگلے صفحات میں آئے گی۔

کیا ان حضرات کا "اھل حدیث" نام صحیح ہے؟

یہ سوال تین پہلوؤں سے قابل غور ہے۔ اوّلاً یہ کہ اہل حدیث نام رکھنے سے یہ تاثر ہوتا ہے کہ شاید یہ گروہ قرآن کریم سے کنارہ کش ہو کر صرف حدیث ہی سے منسلک ہے جیسا کہ فرقہ اہل قرآن کا۔ یہی مفہوم ہے کہ وہ حدیث رسول سے بیزار ہو کر صرف قرآن ہی کو اصل دین سمجھتا ہے۔

سوال کا دوسرا قابل غور پہلو یہ ہے کہ کیا یہی لوگ اہل حدیث ہیں جیسا کہ اس نام کو اپنے لیے خاص کرنے سے ظاہر ہوتا ہے۔ کیا دوسرے لوگ حدیث رسول کو تسلیم نہیں کرتے جب کہ معاملہ برعکس ہے کیوں کہ حدیث کے حاملین وہ ہیں جو الفاظ و مبانی کے ساتھ حدیث کے معانی و مفاہیم پر تدبر رکھتے ہیں۔ اور ان حضرات کا معاملہ خود انھیں کے بڑے کی زبانی سنیے۔

نواب صدیق صاحب رح فرماتے ہیں:

"ولذالك تراهم يقتصرون منها على النقل ولايصرفون العناية الى فهم السنة ويظنون ان ذالك يكفيهم وهيهات بل المقصود من الحديث فهمه وتدبر معانيه دون الاقتصار على مبانيه"[1]

ترجمہ : اس لیے ان لوگوں کو دیکھو گے کہ یہ حضرات محض الفاظ حدیث کی نقل پر اکتفاء کرتے ہیں اور حدیث کے فہم اور اس کے معانی ومفاہیم میں غور وخوض کی طرف متوجہ اور ملتفت نہیں ہوتے۔ اور اس زعم فاسد میں مبتلا ہیں کہ محض الفاظ کا نقل کرلینا ہی ان کے لیے کافی ہے۔ حالانکہ یہ خیال حقیقت سے دور ہے کیونکہ حدیث سے مقصود، حدیث شریف کا سمجھنا اور اس کے معانی ومفاہیم میں تدبر وتفکر کرنا ہے نہ کہ صرف الفاظ حدیث کی نقل پر اکتفا کرنا"۔

نیز نواب صاحب فرماتے ہیں :

" ولا يعرفون من فقه السنة في المعاملات شيأ قليلاً لايقدرون على استخراج مسئلة واستنباط حكم على اسلوب السنن واهلها وهم اكتفوا عن العمل بالدعاوى اللسانية و عن اتباع السنة بالتسويلات الشيطانية "[2]

ترجمہ : یہ لوگ معاملات کے بارے میں فہم حدیث سے بے بہرہ ہیں سنن اور اصحاب سنن کے طرز پر ایک مسئلہ کے استخراج اور ایک حکم کے استنباط پر بھی قادر نہیں، ہیں عمل کے بجائے زبانی دعوؤں اور حدیث کے بجائے مکائد شیطانیہ پر قناعت کیے ہوئے ہیں۔

نیز فرماتے ہیں :

" ولو كان لهم اخلاص ..... لايكتفوا من علم الحديث على رسمه ومن العمل بالكتاب الا على اسمه "[3]

---

[1] الحطی ذکر الصحاح الستہ ص۵۳ ؛ [2] الحطہ ص۵۱ ؛ [3] " ص۱۵۶۔

ترجمہ:۔ اگر یہ مخلص ہوتے تو علم حدیث کے صرف نشان اور عمل بالقرآن کے صرف نام پر اکتفا نہ کرتے۔

ان صراحتوں سے ثابت ہوا کہ ان حضرات کا اہل حدیث نام رکھنا "برعکس نہند زنگی کافور" کی قبیل سے ہے۔

سوال میں تیسری چیز قابل غور یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے نومولود فرقے کا اہل حدیث نام رکھ کر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہمارا یہ فرقہ قدیم الوجود ہے اور قرون اولیٰ ہی سے چلا آرہا ہے۔

چنانچہ "تاریخ اہل حدیث" کے مصنف شیخ احمد دہلوی اپنی کتاب میں مندرجہ ذیل عنوانات قائم کرتے ہیں۔

۱:۔ صحابہ رض اور تمام سلف صالحین اہل حدیث تھے۔

۲:۔ تابعین اہل حدیث کہلائے

۳:۔ مسلمان فاتح اہل حدیث تھے

۴:۔ تبع تابعین اہل حدیث تھے

۵:۔ اہل علم کا لقب اہل حدیث تھا

۶:۔ علمائے امت اخیر زمانے تک اہل حدیث ہوں گے۔

۷:۔ ائمہ اربعہ اہلِ حدیث تھے

۸:۔ ائمہ اربعہ کے اکثر تلامذہ نے اہل حدیث مسلک پر وفات پائی۔

۹:۔ اہل حدیث ہر زمانے میں صحابہ رض جیسے ہیں [1]

نیز کتاب مذکور میں لکھتے ہیں:

"موجودہ تمام فرقوں کو ابھی کوئی جانتا بھی نہ تھا کہ اہل حدیث رسول مقبول م فداہ اُمی وابی کے جانثاروں میں تھے۔ ع

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا [2]

---

[1] ملاحظہ ہو فہرست مضامین کتاب ترجمہ تاریخ اہل حدیث ص ۱۰:۔

[2] ترجمہ تاریخ اہل حدیث ص ۱۷:۔

مزید تحریر فرماتے ہیں :

" آنحضرت ؐ کا فرمودہ ہے کہ لاتزال طائفة من امتی قائمة علی الحق لایضرهم من خالفهم حتی یاتی امر الله" (رواہ البخاری والمسلم)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کی صداقت کا یہ طائفہ زندہ ثبوت ہے اس لیے رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے جملہ ارشادات بتمام وکمال حتی کہ الفاظِ لسانِ وحی، ترجمان کی بھی حفاظت اور تبلیغ آپ کے عہد مبارک سے اس زمانے تک یہی خادمانِ دین برحق کر رہے ہیں [۱]

غیر مقلد عالم مولانا محمد صدیق صاحب شیخ الحدیث فرماتے ہیں :

" لاتزال طائفة من امتی منصورین" حدیث کی تفسیر کرتے ہوئے علی ابن مدینی فرماتے ہیں فهم اصحاب الحدیث (ترمذی باب ماجاء فی اهل الشام)

ترجمہ : اس طائفہ سے مراد اہل حدیث کی جماعت ہے [۲]

ہم یہاں قدرے تفصیل سے واضح کرنا چاہتے ہیں کہ کیا پہلے زمانے میں "اہلحدیث" کا لقب اور اصطلاح انھیں معنوں میں مستعمل تھی جن معنوں میں یہ حضرات مراد لیتے ہیں یا اس لفظ میں تزویر اور تحریف معنوی کا ارتکاب کر کے یہ لوگ لفظ صحیح کو مصداق غیر صحیح پر منطبق کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہم کو محقق کبیر حضرت مولانا عبدالحی فرنگی محلی کے اس تبصرے سے کافی روشنی ملتی ہے۔ مولانا نیچریوں کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں

" واخوانهم الاصاغر المشهورین بغیر المقلدین الذین سمّوا انفسهم اهل حدیث وشتان ما بینهم وبین اصحاب الحدیث [۳]

ترجمہ :۔ نیچریوں کے چھوٹے بھائی جو غیر مقلدین کے نام سے مشہور ہیں اپنے آپ کو اہل حدیث کہتے ہیں حالانکہ ان میں اور اہل حدیث میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔

---

[۱] ترجمہ تاریخ اہل حدیث ص۱۸، [۲] مسلک اہل حدیث ص۱۸،

[۳] الآثار المرفوعۃ ص۲۴۹،

ان حضرات کے "اہل حدیث" ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی عامی اور کتاب وسنت کے نصوص سے ناآشنا ہونے کے باوجود بھی کسی امام ومجتہد کے تقلید واتباع کا قائل نہ ہو۔ نیز ائمہ حدیث وفقہائے کرام ومجتہدین عظام کی خدمات جلیلہ کو اسلام کے لیے مضرت رساں خیال کرے۔ مولانا اسمٰعیل سلفی رح سابق امیر جمعیۃ اہلِ حدیث پاکستان "اہل حدیث" کے نظریات کی ترجمانی کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ائمہ حدیث اور فقہاء کے مباحث، اخاف وشوافع کے مناقشات اسلام کی خدمت کے بجائے بعض مقامات پر اسلام کے لیے نقصان دہ ثابت ہوئے قرآن و سنت کے نصوص باہم منقسم ہو گئے"۔ [1]

مولانا حبیب الرحمان اعظمی محدث تحریر فرماتے ہیں:

"اہل حدیث کی یہ اصطلاح بالکل حادث اور بدعت ہے اس معنی میں کبھی کسی کو اہل حدیث نہیں کہا گیا نہ ان کا پہلے کہیں وجود تھا"۔ [2]

پہلے اہلِ حدیث کن کو کہا جاتا تھا؟

پہلے اہل حدیث ان حضرات کو کہا جاتا تھا جو درسِ حدیث، روایت حدیث، حفظ حدیث، تعلیم حدیث تدبر حدیث یا کسی بھی انداز سے خدمت حدیث کا مشغلہ رکھتے تھے۔ عقائد صحیحہ حقہ کے علمبردار اور اہل سنت والجماعت میں داخل تھے۔ خواہ وہ خود مجتہد رہے ہوں، یا مسالک مجتہدین میں سے کسی کے بھی مقلد رہے ہوں۔ علامہ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر، المتوفی ۸۲۰ھ تحریر فرماتے ہیں:

"اذ من المعلوم ان اهل الحديث اسم لمن عنى به وانقطع فى طلبه كما قال بعضهم،

ان علم الحديث علم رجالٍ ... تركوا الابتداع للاتباع

فاذا جن ليلهم كتبوه ... اذا اصبحوا اعدوا للسماع

---

[1] تحریک اہل حدیث کا مدوجزر ص ۳۔

[2] تحقیق اہل حدیث ۔

فھؤلاء ھم اھل الحدیث من ای مذھب کانوا۔[1]

حضرت امام ترمذی علیہ الرحمہ ایک طویل روایت نقل کرتے ہوئے جس میں ایک اعرابی کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور رسالت، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج کے سلسلہ میں سوال کرنے کا تذکرہ ہے۔ فرماتے ہیں:

"سمعت محمد بن اسماعیل یقول قال بعض اھل الحدیث فقہ ھذا الحدیث ان القراۃ علی العالم والعرض علیہ جائز"[2]

ترجمہ: میں نے محمد بن اسماعیل رح سے سنا وہ فرماتے تھے کہ بعض اہل حدیث کا کہنا ہے اس حدیث کی فقہ یہ ہے کہ عالم سے پڑھنا اور اس کے سامنے مسئلہ پیش کرنا جائز ہے"۔

اس عبارت سے ثابت ہوا کہ امام بخاری علیہ الرحمہ کے نزدیک حدیث میں تدبر اور اس کے معانی و مسائل کا استنباط کرنے والے لوگ اہل حدیث ہیں۔

علامہ احمد بن محمد الخطیب قسطلانی رحمۃ اللہ علیہ ارشاد الساری شرح بخاری کے مقدمہ میں عنوان قائم فرماتے ہیں: "الفصل الاول فی فضیلۃ اھل الحدیث وشرفہ فی القدیم والحدیث" اس عنوان کے تحت یہ دو حدیثیں بیان فرماتے ہیں:

۱۔ "عن ابن مسعود قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نضر اللہ امرأ سمع مقالتی فحفظھا ووعاھا واداھا فرب حامل فقہ الی من ھو افقہ منہ"

ترجمہ: نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، تروتازہ رکھے اللہ تعالیٰ اس آدمی کو جس نے میری بات سنی، اسے یاد کیا، اس کی حفاظت کی اور دوسروں تک پہنچا دیا۔ بعض دفعہ فقہ جس کے پاس پہنچائی جائے وہ پہنچانے والے سے افقہ ہوتا ہے

۲۔ "عن ابن عباس رضی اللہ عنہما قال قال رسول اللہ صلی اللہ

---

[1] الروض الباسم جلد ۱ ص ۱۲۲ مطبوعہ بیروت؛

[2] ترمذی شریف ابواب الزکوٰۃ جلد ۱ ص ۷۹۔

علیہ وسلم اللّٰھم ارحم خلفائی قلنا یارسول اللّٰہ ومن خلفاؤک قال الذین یروون احادیثی ویعلمونھا الناس[1]

ترجمہ:۔ حضور صلی اللّٰہ علیہ وسلم نے فرمایا، اے اللّٰہ میرے خلفاء پر رحم فرما۔ ہم نے کہا۔ آپ کے خلفاء کون ہیں یارسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم۔ آپؐ نے فرمایا، جو لوگ میری احادیث روایت کرتے ہیں اور دوسروں کو سکھاتے ہیں۔

ثابت ہوا کہ حفاظِ حدیث، محافظینِ حدیث، مبلغینِ حدیث، رواۃِ حدیث یہ سب حضرات اہلحدیث ہیں۔ نیز فرماتے ہیں:

"ومن شرف اھل الحدیث ما رویناہ من حدیث عبد اللّٰہ بن مسعود رضی اللّٰہ عنھما قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ان اولی الناس بی فی القیامۃ اصحاب الحدیث قال ابن حبان اذ لیس من ھذہ الامۃ قوم اکثر واصلوۃ علیہ منھا وقال غیرہ المخصوص بھذا الحدیث نقلۃ الاخبار الذین یکتبون الاحادیث ویذبون عنھا الکذب ایام اللیل واطراف النھار، وقال الخطیب فی کتابہ شرف اصحاب الحدیث قال لنا ابونعیم ھذہ منقبۃ شریفۃ یختص بھا رواۃ الاثار و نقلتھا"[2]

ترجمہ:۔ اصحاب حدیث کے فضائل میں سے عبداللّٰہ بن مسعود کی وہ حدیث بھی ہے جس کو ہم نے روایت کیا کہ نبی کریم صلی اللّٰہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن مجھ سے سب سے زیادہ قریب اصحاب حدیث ہوں گے۔ ابن حبان کہتے ہیں کیوں کہ ان سے زیادہ کوئی نبی کریم صلی اللّٰہ علیہ وسلم پر درود پڑھنے والا نہیں ہے۔ بعض دوسرے حضرات کہتے ہیں۔ اس حدیث سے مخصوص حدیث کے وہ ناقلین ہیں جو حدیثوں

---

[1] مقدمہ ارشاد الساری شرح البخاری جلد ۱ ص۴ مطبوعہ نولکشور۔

[2] ارشاد الساری جلد ۱ ص۵ مختصراً۔

کو لکھتے ہیں اور شب و روز ان سے کذب کو دفع کرتے ہیں۔ خطیب نے اپنی کتاب شرف اصحاب الحدیث میں ابو نعیم کے حوالہ سے کہا، یہ بڑی قابل قدر فضیلت ہے جس کے ساتھ حدیثوں کے رواۃ اور ناقلین ہی مخصوص ہیں۔

اس صراحت سے معلوم ہوا کہ درس حدیث، کتابت حدیث، دفاع حدیث کا مشغلہ رکھنے والے حضرات اہل حدیث ہیں۔ علماء سلف اور محدثین کرام کی کتابوں سے مشتے نمونہ از خروارے" کے طور پر چند تصریحات نقل کی گئیں، جن سے بیّن طور پر ثابت ہو گیا کہ اکابر کو جن حقائق اور خصوصات کی بنا پر اہل حدیث کہا گیا تھا ان حقائق سے یہ موجودہ اہل حدیث دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتے اس لیے ان کا نام اہل حدیث کے بجائے لامذہب اور آزاد مشرب ہونا ہی مناسب اور قرین عقل و فہم ہے۔ کیوں کہ فقہا و محدثین کی اصطلاح میں مذہب کا اطلاق بسا اوقات رائے و نقطہ نظر اور مسلک کے معانی پر ہوتا ہے۔ اسی مفہوم کے اعتبار سے ائمہ اربعہ کے مسالک کو وہ لوگ مذہب کے لفظ سے بیان کرتے ہیں۔

حضرت امام نووی شارح مسلم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں،

"فهو مذهبنا ومذهب الجمهور" [1]

نیز فرماتے ہیں،

"فمذهب الشافعي وابي حنيفة والجمهور ان الابل افضل ثم البقر ثم الغنم كما في الهدايا ومذهب مالك" [2]

علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں،

"اذ كانت هذه الاقوال كلها معروفة لاهل السنة ------ ------ بل لاهل المذهب الواحد منهم كمذهب احمد وغيره من الائمه" [3]

---

[1] نووی شرح مسلم جلد ۱ ص ۲۷۷، [2] نووی شرح مسلم جلد ۱ ص ۲۸۱،
[3] منہاج السنہ جلد ۱ ص ۳۱۸۔

اور حضرت شاہ ولی محدث دہلویؒ حجۃ اللہ البالغہ میں باب قائم کرتے ہیں :

" باب اسباب اختلاف مذاهب الفقهاء" [1]

خود غیر مقلد عالم اور محقق نواب صدیق حسن صاحب بھی مذہب کو اسی معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ اپنے وصایا میں دوسری وصیت کے اندر فرماتے ہیں :

" دوم آنکہ مذاہب اربعہ را درحقیقت برابر دانند" [2]

نیز فرماتے ہیں :

" پانی کے مسئلہ میں امام مالک کا مذہب قوی تر ہے اور مسئلہ صیغ تشہد میں حضرت امام ابوحنیفہ کا مذہب صحیح تر ہے و مسئلہ صفات میں امام احمد کا مذہب زیادہ قوی ہے" [3]

ان کا مناسب نام کیا ہوگا ؟ ان عبارات سے واضح ہوا کہ فقہا، و محدثین کے نزدیک (مذہب) کا اطلاق مذاہب ائمہ اربعہ پر بھی ہوتا ہے اور یہ حضرات ان مذاہب اربعہ میں سے کسی میں بھی داخل نہیں ہیں۔ اس بنیاد پر انھیں لامذہب اور آزاد مشرب کہنا زیادہ مناسب اور مبنی بر حقیقت ہے۔

چنانچہ نواب قطب الدین صاحب مظاہر حق اور بعض دیگر علماء نے انھیں " لامذہب " ہی کے نام سے یاد کیا ہے، جیسا کہ گزشتہ صفحات میں نواب صاحب کی عبارت نقل کی جا چکی ہے ——— کسی بھی جماعت کو سمجھنے کے لیے اس جماعت کے بانی اور مرکزی شخصیات کا تعارف بہترین رہنما ہوتا ہے۔ اس لیے آئندہ صفحات پر جماعت اہل حدیث کے بانی اور اہم شخصیات کا تذکرہ پیش کیا جاتا ہے۔

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ص ۳۳۹ ،

[2] ماثر صدیقی حصہ چہارم ص ۱۰۷ ،

[3] " " " ص ۲۰۰ ۔

مولانا عبدالحق بنارسی

م 1276ھ

مولانا عبدالحق بن مولانا فضل اللہ نیوتنی ثم بنارسی کی ولادت قصبہ نیوتنی ضلع انبالہ میں ۱۲۰۶ھ میں ہوئی۔ سفر حج میں سید صاحب رح کے ہم قافلہ تھے۔ لیکن ائمہ کرام پر بدزبانی اور دیگر فاسد نظریات کی بنا پر سید صاحب نے ان کو اپنے قافلہ سے نکال دیا تھا۔ انھیں نازیبا حرکتوں کے مکہ معظمہ میں بھی مرتکب ہوئے، سزائے قید ہوئی، رہا ہوکر مدینہ گئے لیکن "جل گردد جبلت نہ گردد" مدینہ میں بھی ائمہ کرام اور مجتہدین عظام پر زبان درازی کی۔ قاضی مدینہ کے مطلع ہونے کے بعد خوف تعزیر نے وہاں سے بھی راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ غرض طبع و مزاج کی کج ادائیوں نے انھیں ہر محل شرف سے محروم ہی رکھا ہندوستانی علماء میں سب سے پہلے انھیں نے فتنۂ ترکِ تقلید کی بنا ڈالی اور مسلسل علمائے حق سے برسرپیکار رہے، عدم تقلید پر کتابیں بھی لکھیں، مناظرے بھی کیے۔ حکیم مولانا عبدالحی لکھتے ہیں،

ثم سافر الی الحجاز فی رکب السید الامام احمد بن عرفان الشہید البریلوی فلما وصل الی المدینۃ المنورہ بعد الحج تکلم فی بعض المسائل الخلافیۃ علی عادتہ وتفوہ فی حق المجتہدین ورمی بالضلال۔ اصحاب المذاہب الآخر من الاحناف والشافعیۃ وکان اذ ذاک الشیخ محمد سعید الاسلمی بالمدینۃ المنورۃ فوشی بہ الی القاضی فلما علم ذالک عبد الحق خرج من المدینۃ مختفیا وذہب الی الجزیرۃ۔ ــــــــ

وکان عبد الحق لا یتقید بمذہب ولا یقلد احداً فی شیٔ من امور دینیۃ بل یعمل بنصوص الکتاب والسنۃ

سید احمد شہید بریلوی کے قافلہ کی معیت میں حجاز گئے۔ جب حج سے فارغ ہوکر مدینہ پہونچے تو اپنی عادت کے مطابق بعض مسائل خلافیہ میں گفتگو کی۔ اور مجتہدین کرام پر بد زبانی کی اور انہیں گمراہ کہا۔ شیخ محمد سعید نے حاکم مدینہ کو اس کی اطلاع دی، جب عبدالحق کو معلوم ہوا تو آہستہ سے وہاں سے نکل بھاگے۔ ــــــــ

عبدالحق کسی مذہب سے منسلک نہ تھے اور نہ ہی امور دینیہ میں کسی کی تقلید کرتے تھے۔ بلکہ کتاب وسنت کے نصوص

ویجتهد برایه ولذالك جرت بینه وبین الاحناف مباحثات کثیرة فی الاجتهاد والتقلید ومن مصنفاته الدر الفرید فی المنع عن التقلید۔[1]

پر عمل کرتے اور اپنی رائے سے اجتہاد کیا کرتے تھے اسی بناء پر ان کے اور احناف کے مابین اجتہاد اور تقلید کے سلسلہ میں مناظرے ہوئے انہوں نے الدر الفرید فی المنع عن التقلید کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی۔

قاری عبدالرحمٰن صاحب پانی پتی رح شاگرد حضرت شاہ اسحاق صاحب دہلوی رح لکھتے ہیں،

"مولوی عبدالحق بنارسی نے ہزارہا آدمی کو عمل بالحدیث کے پردے میں قید مذہب سے نکالا، اور مولوی صاحب نے ہمارے سامنے کہا کہ عائشہ، حضرت علی رض سے لڑکر مرتد ہوئی اگر بے توبہ مری تو کافر مری (والعیاذ باللہ) اور صحابہ کو پانچ پانچ حدیثیں یاد تھیں ہم کو سب کی حدیثیں یاد ہیں۔ صحابہ رض سے ہمارا علم بڑا ہے، صحابہ کو علم کم تھا۔ بعد تھوڑے عرصہ کے مولوی عبدالحق صاحب، مولوی گلشن علی صاحب کے پاس جو دیوان راجہ بنارسی کے شیعہ مذہب کے تھے، گئے اور کہا کہ میں شیعہ ہوں۔ اب ظاہراً شیعہ ہونا ہوا اور میں نے عمل بالحدیث کے پردہ میں وہ کام کیا کہ عبداللہ بن سبا سے نہ بنا تھا ہزارہا اہل سنت کو قید مذہب سے نکال دیا۔ اب ان کا شیعہ ہونا بہت آسان ہے چنانچہ مولوی گلشن علی صاحب نے تیس روپے ماہواری ان کی نوکری کروادی۔"[2]

مولوی عبدالحق صاحب کا ۱۲۷۶ھ میں انتقال ہوا۔ حکیم مولانا عبدالحی صاحب لکھتے ہیں،

"وتوفی محرماً بمنی فی ثانی ذی الحجه عام ست وسبعین ومائتین والف"[3]

نواب صدیق حسن صاحب

نواب صاحب فرقۂ غیر مقلد کے بہت بڑے پیشوا اور امام ہیں۔ غیر مقلدین میں ان کو مرکزی اور بنیادی شخصیت قرار

م: 1307ھ

---

[1] نزہۃ الخواطر ص ۲۳۹ و ص ۲۴۰ جلد ۸۔

[2] کشف الحجاب ص ۲۱ مصنفہ قاری عبدالرحمٰن پانی پتی۔

[3] نزہۃ الخواطر ص ۲۴۰ جلد ۸۔

دیا جاتا ہے۔ غیر مقلدین ان کو امام السنہ خاتم المحدثین اور مجدد ہند کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ انہیں بعض اعتبار سے "شیخ الکل فی الکل" پر بھی فوقیت حاصل ہے۔ آپ ۱۹ جمادی الاولیٰ ۱۲۴۸ھ میں اپنے نانہال بانس بریلی میں پیدا ہوئے [۱] ابتدائی تعلیم مختلف اساتذہ سے حاصل کر کے اعلیٰ تعلیم آپ نے مفتی صدرالدین صاحب آزردہ دہلوی سے حاصل کی۔ سند حدیث جن اساتذہ کرام سے حاصل کی ان میں شیخ المعمر عبدالحق مرحوم بن فضل اللہ ساکن نیوتنی بانی فرقہ اہل حدیث خاص طور سے قابل ذکر ہیں [۲]

"آپ تقلید کو عار سمجھتے تھے، ائمہ اربعہ کے اقوال تو الگ رہے آپ صحابہ کرامؓ کی تفسیر قرآن کی حجیت کے بھی قائل نہیں تھے۔ ائمہ فقہ و تصوف بالخصوص حضرت امام ابوحنیفہؒ سے سوء ظنی رکھتے تھے" فرماتے ہیں" ہم لوگ صرف کتاب و سنت کی دلیلوں کو اپنا دستور العمل ٹھہراتے ہیں اور اگلے بڑے بڑے مجتہدوں اور عالموں کی طرف منسوب کرنے سے عار کرتے ہیں" [۳]

نیز رقمطراز ہیں:

"حاصل آنکہ حجت بتفسیر صحابہ غیر قائم است لاسیما نزد اختلاف" [۴]

حکیم عبدالحی لکھنوی رح لکھتے ہیں:

"وکان لہ سوء الظن بائمۃ الفقۃ والتصوف جداً لاسیما ابی حنیفہ" [۵]

اس بدگمانی کی وجہ سے نواب صاحب نے حضرت امام ابوحنیفہ اور ان کے تلامذہ کو روایت حدیث میں ضعیف قرار دیا ہے۔ نواب صاحب نے اپنی کتاب "بدور الاھلہ" میں ایک حدیث کا ضعف ثابت کرنے کے لیے اس کے ایک راوی ربیع ابن صبیح پر ائمہ کرام کی جرح نقل کی ہے لیکن چونکہ ائمہ نے انھیں شیخ صالح اور رجل صالح بھی کہا ہے جس سے ان کی توثیق ہوتی ہے۔ نواب صاحب

---

[۱] ملاحظہ ہو ماثر صدیقی ج ۲ ص ۱۔ [۴] ترجمان وہابیہ ص ۲۰۔
[۲] " جلد ۲ ص ۱۔ [۵] رسائل اہل حدیث ص ۲۵ بحوالہ بدور الاھلہ ص ۱۳۹۔
[۳] " ص ۱۷۔ [۶] نزہۃ الخواطر جلد ۸ ص ۱۹۱۔

نے اس توثیق کو رد کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان ائمہ کے صالح کہنے سے راوی کا ثقہ ہونا لازم نہیں آتا جس طرح سے امام ابوحنیفہ باتفاق مخالف و موافق رجل صالح ہیں لیکن وہ ائمہ حدیث کے نزدیک اپنے تلامذہ کی طرح ضعیف ہیں۔ نواب صاحب کے الفاظ ملاحظہ ہوں،

"ابوزرعہ گفتہ "شیخ صالح" وابوحاتم گفتہ رجلٌ صالحٌ انتہی۔ وازوصف بصلاح لازم نمی آید کہ درحدیث ثقہ باشد۔ چنانچہ امام ابوحنیفہ رح مثلاً صالح است باتفاق موافق و مخالف ولکن نزد ائمہ حدیث ضعیف است مثل تلامذہ خود"۔[1]

نواب صاحب نے خود اجتہادی کے زعم میں بزعم خویش بہت سے مسائل ایجاد کیے جو قرآن وحدیث کے سراسر خلاف ہیں۔ ان کی کتاب "بدور الاھلہ من ربط المسائل بالادلہ" سے چند مسائل ذکر کیے جاتے ہیں نواب صاحب کے اجتہاد کے مطابق،

۱:- منی، شراب، مردار، کتا، خنزیر تمام جانوروں کا پیشاب پاک ہے۔[2]

۲:- عورت کی نماز بغیر تمام ستر چھپائے صحیح ہے۔[3]

۳:- چھ چیزوں کے علاوہ بقیہ تمام چیزوں میں سود لینا جائز ہے۔[4]

۴:- جو جانور بندوق کے شکار سے مرجائے وہ حلال ہے۔[5]

۵:- قربانی کی ایک بکری بہت سے گھر والوں کی طرف سے کفایت کرتی ہے اگرچہ سو آدمی ہی ایک مکان میں کیوں نہ ہوں۔[6]

یہ ہے کرشمہ اجتہاد کا ایک ہلکا سا نمونہ۔ ع

جو چاہے آپ کا علم کرشمہ ساز کرے

نواب صاحب اور انگریز

انگریز جس کا ظلم وستم، اسلام بیزاری اور مسلم دشمنی عالم آشکار ہے۔ مسلمانوں پر ان کے مشق وستم کی تفصیل بیان کرتے

---

[1] رسائل اہل حدیث ص۲۶ بحوالہ بدور الاھلہ ص۲۳۵، [2] بدور ص۲۳۵-۲۳۶ :-

۲:- بدور ص۱۵-۱۶ :- ۵ " ص۳۳۵ :-

۳:- " ص۳۹۰ :- ۶ " ص۳۴۱ :-

ہوئے حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رح تحریر فرماتے ہیں :

"زندہ مسلمانوں کو سور کی کھال میں سلوا کر گرم تیل کے کڑھاؤ میں ڈلوانا۔ سکھ رجمنٹ سے علی رؤس الاشہاد اغلام کروانا۔ فتحپوری کی مسجد سے قلعہ کے دروازے تک درختوں کی شاخوں پر مسلمانوں کی لاشوں کا لٹکانا" [1]

یہ ان انگریزوں کا اہل اسلام کے ساتھ سلوک تھا۔ اسلام کے ساتھ تو اس سے بھی بدتر سلوک تھا۔ طرح طرح کے فتنوں اور سازشوں کے منبع و مصدر اور سرچشمہ یہی انگریز ہی بنے ہوئے تھے۔ نیچریت، مرزائیت، اباحیت، فتنہ انکار حدیث وغیرہ بے شمار اسلام دشمن فتنے انھیں انگریزوں کے بطن فتنہ پرور سے پیدا ہو رہے تھے۔ لیکن نواب صاحب انھیں انگریزوں سے دوستی، وفاداری، عشق و محبت کا دم بھرتے تھے اور اپنی بے مثال وفاداری کی داستان ان لفظوں میں سناتے ہیں :

"جو خیر خواہی ریاست بھوپال وغیرہ نے اس زمانہ میں کی ہے وہ گورنمنٹ برطانیہ پر ظاہر ہے۔ ساگر و جھانسی تک سرکار انگریز کو مدد غلہ وغیرہ سے دی جس کے عوض سرکار نے پرگنہ بیرسیہ جمع ایک لاکھ روپیہ عنایت فرمایا" [2]

تعاون علی الاثم والعدوان کی اس اعلیٰ نظیر کے ساتھ ساتھ یہ بھی پڑھتے چلئے، فرماتے ہیں :

"یہ بغاوت جو ہندوستان میں بزمانہ غدر ہوئی اس کا نام جہاد رکھنا ان لوگوں کا کام ہے جو اصل دین سے آگاہ نہیں، اور ملک میں فساد ڈالنا اور امن و امان اٹھانا چاہتے ہیں" [3]

نواب صاحب کے فرزند ارجمند جناب سید علی خاں اپنے والد کے فضائل و مناقب گناتے ہوئے فرماتے ہیں :

"جو ایک دوست دار گورنمنٹ کی مہربانیوں اور احسانوں روز افزوں عزت

---

[1] نقش حیات ص ۴۵۵ ؛ [3] ترجمان وہابیہ ص ۱۰۵ ؛

[2] ترجمان وہابیہ ص ۱۱۳ ؛

افزائیوں کا دل سے ممنون ہو جس کے علم و فضل اور انتظامی کارناموں کی تعریف اور اعمال کا استحسان صاحبان عالی بہادر اور وائسرایان ہند اپنے خرائط اور خطوط اور تقریروں اور پرائیوٹ چٹھیوں میں متواتر کر چکے ہوں جو گورنمنٹ کے جبروت وصولت سے پوری طرح واقف ہو" [1]

جنگ مصر کے موقع پر نواب صاحب کی وفاداریوں سے خوش ہو کر کرنل کنکیڈ صاحب بہادر اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"میں نہایت خوشی سے آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے بلاشبہ نہایت عمدگی سے نواب بیگم صاحبہ کو نیک صلاح دے کر اچھی کارروائی کی تمام بری اور بیوفائی کی باتوں کے ٹالنے اور روکنے کی سعی ایسے وقت میں جب کہ سرکار انگریزی کی فوج مصر کے مخالفین سے جنگ کر رہی ہے۔ فسادی ایسے بڑے شہر میں جہاں ہر قسم کے مسلمان موجود ہیں۔ نواب بیگم صاحبہ عالیہ کی وفاداری کے بے شک آپ باعث ہیں" [2]

صاحبزادہ محترم تحریر فرماتے ہیں:

"اسی طرح وائس صاحب بہادر کرنل بیزمین صاحب بہادر، ولیم ولبی آسبورن صاحب بہادر، بارسٹھ صاحب بہادر، کرنل بریڈو صاحب بہادر، اور متعدد حکام نے والاجاہ (نواب صاحب) کے کاموں کی بے حد تعریف و توصیف کی" [3]

آپ نے ۲۹ جمادی الثانی ۱۳۰۶ھ میں وفات پائی۔

نواب صاحب کی نہایت مستند سوانح مآثر صدیقی میں ہے کہ جس وقت اس حادثۂ دل آشوب کی خبر گورنمنٹ آف انڈیا کو پہنچی تو اس وقت گورنمنٹ کی جانب سے ٹیلیگرام پہنچا کہ:

"منجانب گورنمنٹ آف انڈیا ان کی نعش کے ساتھ شاہی اعزاز عمل میں لایا جائے" [4]

---

[1] مآثر صدیقی جلد ۳ صفحہ ۱۳۳۔
[2] " " " صفحہ ۱۶۵۔
[3] " " " صفحہ ۱۶۵۔
[4] ج ۳، صفحہ ۲۰۳۔

مولانا نذیر حسین صاحب دہلوی

غیر مقلدوں کے امام الہدیٰ آیت من آیات اللہ شیخ الکل فی الکل شمس العلماء مولانا سید نذیر حسین سورج گڈھی ثم دہلوی قصبہ سورج گڈھ ضلع مونگیر صوبہ بہار میں ۱۲۲۰ھ میں پیدا ہوئے [1]

انھیں غیر مقلدین کا رکن رکین اور ستون محکم سمجھا جاتا ہے اپنی جماعت میں ان کی ہستی بڑی مایۂ ناز، قابل فخر ہے۔ غیر مقلدیت کی فروغ و اشاعت میں ان کی خدمات کا بڑا دخل ہے انھوں کے زندگی کے پورے ۷۵ سال سلف صالحین پر تنقید کرنے اور ان کے عظیم دینی اور علمی کارناموں میں کیڑے نکالنے اور اپنے خود ساختہ الزامات کا ہدف بنانے میں صرف ہوئے۔

اکثر غیر مقلد علماء کے آپ استاذ ہیں۔ آپ اپنے آپ کو شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے نواسے حضرت شاہ اسحٰق کا شاگرد بتلاتے ہیں۔ لیکن اس نسبت میں کہاں تک سچائی ہے اس کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت شاہ اسحٰق کے تلمیذ اجل اور حضرت شاہ عبدالعزیز رح کی مجالس وعظ کے حاضر باش قاری عبدالرحمان صاحب رح پانی پتی لکھتے ہیں:

"سید نذیر حسین نے کس روز میاں صاحب سے پڑھا ہے فقط ہجرت کے ایام میں بطمع اغواء خلق کے ایک ایک حدیث اوائل چند کتب کی سنا کر ایک پرچہ سند کا لکھوالیا وعظ میں بھی کبھی کبھی جانا نصیب ہوا ہو۔ کبھی کبھی تعطیل میں مسئلہ پوچھنے آتے تھے، اور حفیظ اللہ خاں صاحب وعظ میں جاتے تھے۔ کبھی کبھی کوئی حرف جلالین کا پوچھنے آتے تھے۔ اور جناب مولانا شاہ عبدالعزیز رح کے زمانے میں تو ان دونوں کا وجود بھی دہلی میں نہ تھا۔ کبھی ان کو ہم نے بڑے شاہ صاحبؒ کے زمانے میں نہیں دیکھا۔ دونوں میاں صاحب اہل سنت اور حنفی تھے اور یہ متقی (تقیہ کرنے والے) غیر مقلد دشمنان اہل سنت ہیں پھر کس طرح؟ جناب میاں صاحب کے تلمذ کے وسیلے سے ان کو مانتے ہیں اور اپنا دین برباد کرتے ہیں" [2]

---

[1] نتائج التقلید ص۱۱ بحوالہ انگریز اور اہل حدیث ص۲۲۔

[2] رسائل اہل حدیث ص۳۰ بحوالہ کشف الحجاب ص۱۳۔

مولانا حکیم عبدالحیٔ ان کے حلقۂ درس کا ایک نقشہ بیان کرتے ہیں کہ:

"شواہد میں اعشیٰ کا ایک شعر آگیا اس میں دیر تک قاری اور سامع متوجہ رہے پھر بھی ناکام رہے"۔[1]

اس مبلغ علم کے باوجود جرأت کا یہ عالم ہے کہ:

"ہمت آپ کی بالکل طرف مطاعن فقہاء اور تخیلات صحابہ کے مصروف ہے"۔[2]

مولوی نذیر صاحب اور انگریز

انگریزوں کی سفاکیوں سے تنگ آکر اس دور کے مشاہیر و اکابر جید علماء کرام نے انگریز کے خلاف جہاد کا فتویٰ تیار کیا لیکن میاں نذیر حسین نے نہ صرف یہ کہ اس پر دستخط کرنے سے انکار کیا بلکہ انگریزوں سے وفاداری کا دم بھرتے ہوئے اس فتوے کی شدید مخالفت بھی کی۔ میاں صاحب کے سوانح نگار مولوی افضل حسین بہاری لکھتے ہیں کہ:

"یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ میاں صاحب گورنمنٹ انگلشیہ کے کیسے وفادار تھے۔ زمانہ غدر ۱۸۵۷ء میں جب دہلی کے بعض مقتدر اور بیشتر معمولی مولویوں نے انگریز کے خلاف فتویٰ جہاد کا دیا تو میاں صاحب نے اس پر دستخط کیے، نہ مہر لگائی، خود فرماتے تھے کہ میاں وہ ہلڑ تھا شاہی نہ تھی وہ بے چارہ بوڑھا بادشاہ کیا کرتا بہادر شاہ کو بہت سمجھایا کہ انگریزوں سے لڑنا مناسب نہیں مگر وہ باغیوں کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے۔ کرتے تو کیا کرتے"۔[3]

یہ وہ دور تھا کہ انگریزوں کی طرف سے مسلمان عورتوں کی عزت لوٹی جاتی تھی انکے پستان تک کاٹ ڈالتے تھے، مسلمانوں کی لاشیں درختوں کی شاخوں پر لٹکائی جاتی تھیں لیکن میاں صاحب کو ان مسلمان عورتوں اور مردوں پر رحم نہیں آیا، آیا تو کس پر آیا۔ ملاحظہ ہو:

"ڈاکٹر حافظ مولوی نذیر احمد صاحب فرماتے تھے کہ عین زمانہ غدر میں مسز لیبس

---

[1] دہلی اور اس کے اطراف ص۲۷۔ [2] الحیات بعد الممات ص۱۲۵۔

[3] کشف الحجاب ص۹ بحوالہ رسائل اہل حدیث ص۳۳۔

زخمی میم کو جس وقت میاں صاحب نے دیکھا تو روئے اور اپنے مکان میں اٹھا لائے اپنی اہلیہ اور عورتوں کو ان خدمت کے لیے نہایت تاکید کی ۔ ۔ ۔ ۔ امن وامان قائم ہونے کے بعد میم کو انگریزی کیمپ میں پہنچایا جس کے نتیجے میں آپ کو اور آپ کے متوسلین کو گورنمنٹ انگریزی کی طرف سے امن وامان کی چٹھی ملی" [1]

انھیں خدمات عظیمہ کے صلہ میں سفر حج کو جاتے ہوئے میاں صاحب کو سرکار کی طرف سے سند ملی تھی جس کا ترجمہ یہ ہے :

"مولوی نذیر حسین دہلی کے ایک بڑے مقتدر عالم ہیں جنھوں نے مشکل اور نازک وقتوں میں اپنی وفاداری اور نمک حلالی گورنمنٹ برطانیہ پر ثابت کی اب وہ اپنے فرض زیارت کعبہ کے ادا کرنے کو جاتے ہیں امید کرتا ہوں کہ جس کسی افسر برٹش گورنمنٹ کی مدد چاہیں گے وہ ان کی مدد کرے گا کیوں کہ وہ کامل طور سے اس کے مستحق ہیں" [2]

میاں صاحب کا انتقال ۱۳۲۰ھ میں ہوا ۔

مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی

۱۲۵۶ھ میں پیدا ہوئے ۔ سید نذیر حسین صاحب کے خصوصی تلامذہ میں تھے ۔ مولانا حکیم عبدالحی صاحب لکھتے ہیں :

"ثم لازم السید نذیر حسین المحدث وقرأ علیہ المشکوٰۃ والصحاح الستۃ وصحبہ مدۃ طویلۃ" [3]

ان کی شخصیت جماعت اہل حدیث میں نامی گرامی اور نہایت ہی عظیم ہے اپنے رسالہ اشاعۃ السنۃ کے ذریعہ انھوں نے غیر مقلدیت کی خوب خوب اشاعت کی ، انھیں کی کوششوں سے غیر مقلدوں کا نام اہل حدیث ہوا ۔ طبیعت میں مذہبی تعصب بدرجہ اتم تھا ۔ صاحب نزہۃ الخواطر کہتے ہیں :

"ویرد علی کل من یخالفہ فی فرط فی ذالک وجاوز عن حد

---

[1] الحیاۃ بعد المماۃ ص ۲۷۵ ۔ [3] نزہۃ الخواطر ص ۴۲۷ جلد ۸ ۔

[2] " ص ۱۴ ۔

القصد والاعتدال وشدد النكير على مقلدي الائمة الاربعة لاسيما الاحناف وتعصب في ذلك تعصبا غير محمود فثارت به الفتن "[1]

مولانا محمد حسین صاحب اور انگریز

مولوی حسین صاحب انگریز نوازی میں اپنے دونوں پیشروؤں سے بھی آگے تھے۔ مشہور مورخ پروفیسر محمد ایوب قادری تحریر فرماتے ہیں کہ:

"مولوی محمد حسین بٹالوی نے سرکار برطانیہ کی وفاداری میں جہاد کی منسوخی پر ایک مفصل رسالہ "الاقتصاد فی مسائل الجہاد لکھا"[2]

رسالہ مذکور میں مولوی صاحب لکھتے ہیں:

"ہندوستان دارالاسلام ہے اس لیے یہاں جہاد جائز نہیں بلکہ اس وقت پوری دنیا میں کہیں بھی جہاد جائز نہیں"[3]

اس خدمت کے صلہ میں مولوی صاحب کو حکومت کی طرف سے جاگیر عطا کی گئی تھی[4]

---

[1] نزھۃ الخواطر ص۲۸، ۷۔
[2] جنگ آزادی ص۶۔
[3] الاقتصاد فی مسائل الجہاد ص۲۵۔
[4] ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ص۲۹۔

بابت سال ۱۴۱۵ھ

تیسرا محاضرۂ علمیہ

بر موضوع

پیش کردہ

جناب مولانا محمد راشد صاحب اعظمی

استاذ فقہ دار العلوم دیوبند

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تقلید شخصی ہی کا وجوب کیوں ؟

الحمد للہ وکفی وعلیٰ عبادہ الذین اصطفی

گذشتہ مباحث سے یہ بات منقح ہو چکی کہ تقلید کی دونوں نوعوں یعنی معین اور غیر معین کا وجوب کتاب وسنت، قیاس اور اجماع امت اور حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے تعامل سے بڑی صراحت اور وضاحت کے ساتھ ثابت ہے۔ اس طرح سے اصطلاح فقہاء کے مطابق تقلید اپنی اصل کے اعتبار سے واجب مخیر ہوئی۔

واجب مخیر کی حقیقت یہ ہے کہ وجوب کا تعلق دو یا چند متعین امور میں سے کسی فرد مبہم کے ساتھ ہو کہ آدمی ان امور میں سے جس فرد کو ادائیگی کے لئے متعین کرلے اسے اختیار ہے اور اس فرد کو ادا کر لینے سے واجب ادا ہو جائے گا ---------- تو گویا کہ ان امور میں سے کسی ایک کا ادا کرنا تو واجب ہے۔ لیکن اس ایک کی تعیین کے سلسلہ میں آدمی مختار ہے مثلاً کفارۂ یمین کہ نفس کفارہ تو فرض ہے لیکن ادا کرنے والے کو اس کا اختیار ہے کہ کھانا کھلائے، یا مسکینوں کو کپڑا دے، یا غلام آزاد کرے۔

صاحب مسلم الثبوت فرماتے ہیں:

ایجاب امر من امور معلومۃ صحیح	امور معلومہ میں سے کسی ایک کو واجب کرنا صحیح
وھو الواجب المخیر کخصال	ہے اور اس کو واجب مخیر کہتے ہیں جیسے کفارہ کے

الکفارۃ [1] افراد۔

شیخ محمد حضری بک رح واجب مخیر کی تشریح و تفصیل کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

منقسم الی معین ومخیر فالمعین ما طلبه الشارع عینا والمخیر ما طلبه الشارع مبهمًا فی واحدٍ من امور معینة کاحد خصال الکفارة قد یعین الشارع مطلوبه فیسمی هذا الواجب معینًا وقد یبهمه فی واحدٍ من امور معینةٍ نحو قوله تعالیٰ فی کفارة الیمین "فکفارته اطعام عشرة مساکین من اوسط ما تطعمون اهلیکم اوکسوتهم او تحریر رقبة" ویسمی هذا واجبًا مخیرًا فالتکلیف یتعلق بواحد مبهم من هذه الامور الثلاثة المعینة والواحد المبهم قدر مشترک بین الخصال کلها لصدقه علی کل واحد منها وحینئذٍ لاتعدد فیه [2]

واجب معین اور مخیر کی طرف منقسم ہوتا ہے۔ معین وہ جس کو شارع نے بعینہٖ طلب کیا ہو، اور مخیر وہ ہے جس کو شارع نے لاعلی التعیین امور معلومہ سے کسی ایک کے اندر طلب کیا ہو۔ جیسے کفارہ کے افراد میں سے کوئی ایک کبھی شارع اپنے مطلوب کو متعین کر دیتے ہیں تو اس واجب کو معین کہا جاتا ہے اور کبھی امور معلومہ میں سے کسی ایک کے اندر مبہم رکھتے ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ کا قول کفارہ یمین میں فکفارتہ الخ" تو اس کا کفارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے۔ اس اوسط کھانے میں سے جس کو تم اپنے گھر والوں کو کھلاتے ہو، یا ان کو کپڑا دینا ہے یا غلام آزاد کرنا ہے"

اس واجب کو واجب مخیر کہتے ہیں۔ تو تکلیف کا تعلق ان تینوں امور میں سے کسی واحد مبہم سے ہے اور واحد مبہم ان تمام افراد کے درمیان قدرِ مشترک ہے اس کے ہر ہر فرد پر صادق آنے کی وجہ سے تو اس وقت وجوب میں تعدد نہیں ہوگا۔

"واجب مخیر" اور نفس تقلید کے واجب مخیر ہونے کی محققانہ تشریح کرتے ہوئے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ایک سائل (جس کا یہ خیال تھا کہ تقلید شخصی مباح ہے اور اس کو واجب کہنا بدعت سیئہ ہے)

---

[1] مسلم الثبوت صـ۲۹۔ [2] اصول الفقہ للحضری بک صـ۴۶۔

کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں :

"پس تقلید مطلق تو فرض ہے یقین ہے کہ آپ بھی قبول کر لیں گے، ورنہ اثبات اس کا کر دیا جائے گا اور اس کے دو فرد ہو ویں گے۔ تقلید شخصی اور غیر شخصی کیوں کہ دونوں حصے ایک جنس کے ہیں خواہ اسکو جنس کی دو نوع کہو یا مطلق اور دو فرد مقید کہو، خواہ کلی اور دو جزوی کہو جس طرح چاہو مقرر کرو۔ بہر حال دو نوع تقلید مطلق کے ہو ویں گے جو فرض ہے۔

بھلا آپ سے پوچھتا ہوں کہ فرض کے نوع یا فرد مباح کس طرح ہوئے مرد خدا فرض اور مباح تو مباین دو نوع ہیں کہ تحت جنس حکم کے ہیں پھر ایک نوع مباین دوسری نوع کی فرد کس طرح ہوگی۔ ذرا سوچو کہ تقلید مطلق تو فرض اور شخصی مباح اور حالانکہ یہ فرد ہے تقلید فرض کی۔ پس تمام آپ کا خدشہ اس ہی خطاء فہم پر مبنی ہے۔ پس ہوش کرو کہ تقلید بہر دو نوع فرض ہے کوئی مباح نہیں، مگر چونکہ امتثال امر تقلید میں تخییر ہے کہ جس فرد کو چاہو ادا کر دو، دوسرے کی ضرورت نہیں اور جو دونوں نہ کرو گے تو عاصی ہوگے اس تخییر کو مباح کہہ دیا ہے مجازاً نہ یہ کہ خود شخصی مباح ہے اس کی ایسی مثال ہے کہ کفارہ میں حلف کے مثلاً نفس کفارہ فرض ہے اور اطعام اور کسوہ اور رقبہ میں تخییر جس کو ادا کر دیا مطلق کفارہ سے برات ہوگئی اور جو کسی کو نہ کیا، عاصی رہا علی ھذا مطلق اضحیہ واجب اور بکرا، اور سبع بقر وابل اور پھر نر، یا مادہ وغیرہا جزئیات میں خیار جس فرد کا آتی ہوا، آتی فرض ہی کا ہوا، مباح کوئی بھی نہیں، سب فرض ہیں مگر ایک کے اتیان سے سب سے بری ہو جاتا ہے۔ یہی حال جملہ کلیات کا ہے کہ مطلق شرعی فرض ہوتا ہے اور مباح کہنا ان کا باعتبار اختیار کسی فرد کے ہے نہ کہ مباح مقابل فرض کے کہ آپ نے شبہ فرض ہو جانے، مباح کا بے موقع کیا، ورنہ اگر یہی شبہ ہے تو شخصی والے اسی آپ کی تقریر سے غیر شخصی کو بدعت سیئہ کہہ دیویں گے کیوں کہ غیر شخصی کس طرح فرض ہوتی ہے وہ بھی تو مباح بہیں معنی ہے جو مذکور ہوا۔۔۔ اور شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہاں کہا ہے کہ غیر شخصی کے وجوب پر اجماع منعقد ہوا

ہے تاکہ مقابل نوع اس کے حرام ہو۔ کیوں کہ وجوب کا مقابلہ حرمت سے ہوتا ہے، اگر فرضاً یہ بھی ہے تو شخصی مباح کس طرح ہوگئی بلکہ حرام ہوئی اور یہی کوتاہ فہمی غیر مقلدین جہاں کو ہوئی بلکہ (شاہ صاحب نے) یہ فرمایا ہے کہ قرون ثلثہ میں بھی اجماع جائز رہا ہے۔

پس جواز سے دوسری نوع مقابل کی کراہت کس طرح ثابت ہوگئی، امکانِ خاص تو پڑھا ہی ہوگا اور شرع میں ایک فرد کلی کے جواز سے دوسرے فرد کی کراہت کہاں ثابت ہے۔ جواز اضحیہ شاۃ سبع سے جو صحابہ میں شائع رہا۔ سبع بقر حرام کیوں کر ہوا بلکہ کلی کے حکم سے سب افراد جائز ہیں اور تعامل فرد واحد سے دیگر افراد مرتفع نہیں ہوتے۔ مساوی الاقدام رہتے ہیں۔ پس اگر یہ قاعدہ ذہن نشین ہوگیا ہے تو سوچو کہ جیسے آپ کے نزدیک شخصی مباح ہے ایسے ہی غیر شخصی بھی مباح ہے اور جیسا کہ غیر شخصی مرادف اس کی ہے آپ کے نزدیک واجب ہے ویسے ہی معین کہ شخصی اس کی مرادف ہے واجب ہی ہے اور حق یہی ہے کہ دونوں واجب ہیں اور اباحت دونوں میں بمعنی تخییر ارتکاب احدہما ہے اور بس... اپنی ذات میں دونوں فرض ہیں تو آپ کا شبہ تو گاؤ خر دہوا" [1]

الحاصل تقلید اپنے دونوں افراد کے اعتبار سے واجب مخیر ہوئی ... واجب مخیر کے افراد میں سے جس کو بھی ادا کر دیا جائے۔ آدمی وجوب سے بری الذمہ ہو جاتا ہے لیکن افراد ادا کرنے سے پہلے تخییر اور تعیین کے اعتبار سے مباح رہتے ہیں۔

مفتی برکت اللہ صاحب فرنگی محلی رح فرماتے ہیں:

"الوجوب التخییری انما یکون بین الجائزات" [2]

مطلب یہ ہے کہ وہ افراد ایک ایک کر کے مباح ہیں اور ان کے درمیان واحد مبہم اور قدر مشترک

---

[1] مکتوب حضرت گنگوہی رح تالیفات رشیدیہ صـ ۵۲۸-۵۲۹۔

[2] التعلیق المنعوت علی مسلم الثبوت صـ ۲۹

واجب ہے۔ مباح بلکہ مندوب کے سلسلہ میں یہ ضابطہ ہے کہ اگر اس کے کرنے کی وجہ سے کسی فتنہ کا خدشہ اور اندیشہ ہو تو وہ مباح ممنوع ہو جاتا ہے۔

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :

"جس امر مباح مندوب کا سبب عوام کے اعتقاد میں فساد کا اندیشہ ہو تو اس کا اس طرح کرنا ممنوع ہے کہ اس کو تغیر حکم شرعی کا لازم ہو جائے۔ عند العوام اور دفع فتنہ عوام کا حتی الامکان واجب ہے" [1]

نیز فرماتے ہیں :

"اگر ..... عوام کو فساد عقیدہ حاصل ہو تو اس کا ترک کرنا لازم ہے اگرچہ امر استحباب کے درجہ میں ہو نہ سنت موکدہ اور واجب کے" [2]

اس ضابطہ کی چند نظائر بیان کرتے ہوئے حضرت گنگوہی رح فرماتے ہیں :

"سنو خاتم بائیں ہاتھ میں صحابہ رض کے قرن میں مباح تھی پیچھے بوجہ مشابہت روافض کے یہ بھی فتنہ ہے لقولہ من تشبہ بقوم فھو منھم مکروہ تحریمی ہوئی' ہدایہ دیکھ لو پس یسار کا تختم اور یمین کا تختم دونوں جائز' اور قرون ثلثہ میں یمین کا مباح رہا اور پھر یسار کا مکروہ ہوا تو ترک تختم یسار واجب ہوا کہ ترک مکروہ واجب ہے... بحق فلاں کہنا' اول مباح تھا۔ فقہاء نے ترک کو اس کے واجب کیا بسبب فتنہ عوام اور شیوع مذہب معتزلہ کے کہ ان کے نزدیک حق علی اللہ ہے ثواب مطیع اور عذاب عاصی" [3]

محض "سد الذرائع" بعض دفعہ مباحات' ممنوعات کی صف میں داخل ہو جاتے ہیں علامہ ابراھیم بن موسی رح شاطبی صاحب الاعتصام نے اس سلسلہ میں نہایت ہی قیمتی بحث کی ہے فرماتے ہیں :

---

[1] براہین قاطعہ صـ۱۱۸ ۔ [3] سبیل الرشاد۔ تالیفات رشیدیہ صـ۵۳۱ ۔

[2] " صـ۱۱۸ ۔

قد یکون اصل العمل مشروعا ولکنه یصیر جاریا مجری البدعة من باب الذرائع

بعض دفعہ اصل عمل مشروع ہونے کے باوجود سدذرائع کے طور پر بدعت کے درجے میں آجاتا ہے۔

نظائر پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

ولاجله ایضا نهی اکثرهم علی اتباع الآثار کما خرج الطحاوی وابن وضاح وغیرهما عن معزوز بن سوید الاسدی قال وافیت الموسم مع امیر المومنین عمر بن الخطاب رضی الله عنه فلما انصرفنا الی المدینة انصرفت معه فلما صلی لنا صلاة الغداة فقرأفیها "الم ترکیف فعل ربك" و" لایلاف قریش" ثم رأی اناسا یذهبون مذهبا فقال این یذهب هؤلاء قالوا یأتون مسجدا ههنا صلی فیه رسول الله صلی الله علیه وسلم فقال انما هلك من کان قبلکم بهذا یتبعون آثار انبیاءهم فاتخذوها کنائس وبیعا من ادرکته الصلوٰة فی شئ من هذه المساجد التی صلی فیها رسول الله صلی الله علیه وسلم فلیصل فیها والا فلا یتعمدها وقال ابن وضاح سمعت عیسی بن یونس مفتی اهل طرسوس

اسی بنیاد پر اکثر علماء نے "آثار" کی زیارت کو منع قرار دیا ہے جیساکہ طحاوی اور ابن وضاح وغیرہ نے معزوز بن سوید اسلمی سے بیان کیا ہے۔ کہ انھوں نے فرمایا میں موسم حج میں امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہوا۔ جب ہم مدینہ کو چلے تو میں نے حضرت عمر رضہ کا ساتھ اختیار کیا انہوں نے ہمیں فجر کی نماز پڑھائی جس میں "الم ترکیف فعل ربك اور لأیلف قریش" پڑھا پھر انہوں نے کچھ لوگوں کو دیکھا جو کسی طرف جارہے تھے۔ پوچھا یہ حضرات کدھر جارہے ہیں لوگوں نے بتلایا یہ حضرات یہاں ایک مسجد میں آتے رہتے ہیں، اس مسجد میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز ادا فرمائی تھی۔ اس پر حضرت عمر رضہ نے فرمایا، تم سے پہلے کے لوگ اسی بنیاد پر ہلاک ہوئے وہ اپنے انبیاء کے نشانات پر جاتے اور اس کو عبادت گاہ بنا لیتے تھے۔ جس آدمی کو نماز کا وقت ایسی مساجد میں مل جائے جن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی ہے تو اس میں نماز

يقول امر عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بقطع الشجرة التی بويع تحتها النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقطعها لان الناس كانوا يذهبون فيصلون تحتها فخاف عليهم الفتنة ..... وقد كان مالك رح يكره المجئ الى البيت المقدس خيفة ان يتخذ ذالك سنة وكان يكره مجئ قبور الشهيد ويكره مجئ قباء خوفا من ذالك مع ماجاء فی الآثار من الترغيب فيه ولكن لما خاف العلماء عاقبة ذالك تركوه ۔

پڑھ لے ورنہ ان کا قصد نہ کرے .... اور ابن وضاح نے کہا کہ میں نے عیسیٰ بن یونس مفتی اہل طرسوس سے فرماتے ہوئے سنا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس درخت کو کاٹ دینے کا حکم دیا تھا جس کے نیچے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی گئی تھی اس لئے کہ لوگ جاتے تھے اور اس کے نیچے نماز پڑھتے تھے تو حضرت عمر رض نے ان کے سلسلہ میں فتنہ کا خوف کیا ..... اور امام مالک رح بیت المقدس کی طرف جانا ناپسند کرتے تھے۔ محض اس اندیشہ سے لوگ اسے ایک سنت نہ بنالیں، اور اسی طرح شہدائے کرام کی قبروں اور قبا کی طرف بھی جانے سے گریز کرتے تھے حالانکہ اس سلسلہ میں ترغیبی آثار بھی وارد ہوئے ہیں۔ لیکن علماء نے انجام کے خوف سے اسے ترک کر دیا۔

چند سطور بعد تحریر فرماتے ہیں :

وقال سعيد بن حسان كنت اقرأ على ابن نافع فلما مررت بحديث التوسعة ليلة عاشوراء قال لی حوق عليه قلت ولم ذالك يا ابا محمد ؟ قال خوفا من ان يتخذ سنة. فهذه الامور جائزة او مندوب اليها ولكنهم كرهوا فعلها خوفا من

سعید بن حسان کہتے ہیں کہ میں علی بن نافع کے پاس حدیث پڑھ رہا تھا جب شب عاشوراء میں توسع والی حدیث کو پڑھا تو انہوں نے مجھ سے فرمایا، اس حدیث کو قلم انداز کر دو میں نے کہا، اے ابو محمد یہ کیوں ؟ انہوں نے کہا اس خوف سے کہ کہیں اسے ایک رواج نہ بنا لیا جائے، تو یہ امور جائز یا مندوب تھے

البدعۃ[1] لیکن لوگوں نے اس کو ناپسند قرار دیا محض اندیشۂ بدعت کی بنیاد پر۔

اس بحث پر مزید تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

۴ مستحسن پر غیر مستحسن کی ترجیح بنظر مزید توضیح یہ امر اور بھی عرض کئے دیتا ہوں کہ شرع میں یہ امر کثیر الوقوع ہے کہ بعض چیزیں اصل سے مباح بلکہ مستحسن ہوتی ہیں۔ مگر بعض امور خارجہ، امر غیر مستحسن کو ترجیح دینی مستحسن ہو جاتی ہے اور اس وقت میں بھی جانب مستحسن ہی کو ترجیح دینا ان کا کام ہے جو عقل دوربین نہیں رکھتے اور حدیث میں اس قسم کے امور بکثرت ملیں گے۔

دیکھئے بہ احادیث صحیحہ میں یہ امر موجود ہے کہ بوقت نزولِ قرآن مجید جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے جناب باری میں مکرر، سکرر عرض معروض کر کے قرآن مجید کے سات حروف مشہورہ پر پڑھنے کی اجازت لی، اور حضرت عثمان رض کے زمانہ خلافت میں حسب رائے اور استحسانِ جماعت صحابہ بوجہ ظہور وانتشارِ اسلام و قرآن فی بلاد العجم ——— اس توسع کو ——— کہ جس کو خاتم النبیین نے باصرار و دعائے مکررہ بوجہ مصلحتِ امت جناب باری سے حاصل کیا تھا، اور جن حروف کی شان میں حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فکل حرفٍ منھا کافٍ فرمایا تھا ——— موقوف کر دیا اور حضرات صحابہ نے اس توسع کے عوض اس زمانہ کے مناسب حال سمجھ بوجھ کر قرأت قرآن کو منحصر فی حرفٍ واحدٍ فرما دیا۔ رئیس المجتہدین تو شاید حضرات صحابہ رض پر یہی طعن کریں کہ سب صورِ مباح کو ترک کر کے فی صورۃ واحدۃ کیوں کیا؟

اور سنئے! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کا جی چاہتا تھا کہ بنائے کعبہ کو گرا کر بنائے ابراہیمی کے مطابق تیار فرما دیں، مگر بعض مسلمانوں کے انکار اور دین کے پھر جانے کے خوف کی وجہ سے آپ رک گئے۔ چنانچہ الفاظ حدیث

---

[1] الاعتصام جلد ۲ ص ۹۲-۹۵-۹۷۔

اس پر شاہد ہیں، باوجودیکہ آپ امر کو مستحسن سمجھتے تھے مگر فقط بدیں خیال کہ یہ امر کوئی مقصود فی الدین نہیں، اور اس کے نفع کے مقابلہ میں بڑے نقصان کا اندیشہ ہے اسلئے اس امر کو گو عمدہ تھا ترک فرمایا۔

علاوہ ازیں حدیثوں سے زمانہ نبوی میں عورتوں کا نماز کے لئے مسجدوں میں جانا ثابت ہوتا ہے اور یہ امر ثبوت اباحت امر مذکور کے لئے دلیل کافی ہے۔ پھر دیکھئے باوجود اس کے کہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عورتوں کو مساجد میں جانے سے منع فرمایا اور عورات مسلمین اس امر کی شکایت جب حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں لے گئیں، اور کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں باوجودیکہ ہم مسجد میں چلی آیا کرتی تھیں مگر اب ہم کو مساجد میں جانے سے روکا جاتا ہے، تو حضرت عائشہ رض نے بھی یہی فرمایا کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عورات کے اس حال کو ملاحظہ فرماتے تو بے شک مساجد میں آنے جانے سے منع فرما دیتے۔ اس کے سوا اور بہت سے امور خاص حدیث میں اس قسم کے ملتے ہیں[1]۔

قرون اولیٰ کے بعد جب شہوت پرستی اور اتباع ہوئی نے لوگوں کے دلوں میں گھر کرنا شروع کر دیا حکم خدا اور رسول کے بجائے حرام وحلال کا پیمانہ لوگوں کی خود اپنی ہی طبائع اور خواہشات بن گئیں تو فقہاء امت نے بین طور پر محسوس کیا کہ اس صورت حال میں اگر تقلید مطلق کا دروازہ کھلا رہا تو بہت سے لوگ دیدہ ودانستہ اور بہت سے لوگ غیر شعوری طور پر اتباع نفس و ہوئی اور خواہش پرستی میں مبتلا ہو جائیں گے۔

مثلاً ایک شخص کا سردی کے موسم میں خون نکل آیا تو امام ابو حنیفہ رح کے نزدیک اس کا وضو ٹوٹ گیا۔ امام شافعی رح کے نزدیک نہیں ٹوٹا۔ وہ اپنی تن آسانی کی وجہ سے اس وقت امام شافعی رح کی تقلید کر کے بلا وضو نماز پڑھ لے گا۔ پھر اس نے کسی عورت کو مس کر لیا تو امام شافعی رح کے نزدیک اس کا وضو جاتا رہا۔ اور امام ابو حنیفہ رح کے نزدیک برقرار رہا۔ اس کی نفس پرستی اس موقع پر امام ابو حنیفہ کی تقلید پر آمادہ کرے گی اور پھر بے وضو ہی نماز پڑھ لے گا۔ غرض جس امام کے قول میں اسے اپنا نفسانی فائدہ

---

[1] ایضاح الادلہ ص ۲۳۳۔

اور آرام نظر آئے گا۔ اس کو اختیار کرے گا اور جس میں اپنی خواہشات کی رو برآری نظر نہیں آئیگی اسے ترک کردے گا۔ اس طرح سے احکام شرعیہ نفسانی خواہشات کا کھلونا بن کر رہ جائیں گے اس لئے سد ذریعہ کے طور پر علماء کرام نے تقلید مخیرہ کے دونوں افراد میں سے شخصی کو متعین اور غیر شخصی کو ممنوع قرار دے دیا، بخلاف قرون اولیٰ کے کہ غلبہ خیر کی بنیاد پر ان مفاسد کا احتمال بعید تھا ساتھ ہی ساتھ مختلف فقہاء اور مجتہدین کے مسالک مرتب اور مدون نہیں تھے کہ ایک خواہش پرست اور رخصتوں کا متلاشی انسان، مختلف مسالک کی رخصتوں کو بآسانی تلاش کرلیتا۔ نیز مذاہب کا مکمل طور پر مدون نہ ہونا تقلید شخصی کی تعیین کے سلسلہ میں مانع تھا۔ ان وجوہات کی بنیاد پر شخصی اور غیر شخصی دونوں کا شیوع تھا۔

شیخ الاسلام علامہ نووی رح فرماتے ہیں، (اس تقلید شخصی کے لازم ہونے) کی وجہ یہ ہے

ووجهه انه لوجاز اتباع اى مذهب شاء لافضىٰ الى ان يلتقط رخص المذاهب متبعا هواه ويتخير بين التحليل والتحريم والوجوب والجواز وذالك يودى الى انحلال ربقة التكليف بخلاف العصر الاول فانه لم تكن المذاهب الوافية باحكام الحوادث مهذبة فعلىٰ هذا يلزمه ان يجتهد فى اختيار مذهب يقلده على التعيين[1]	کہ اگر اس بات کی اجازت ہو کہ انسان جس فقہی مسلک کی چاہے پیروی کرلیا کرے تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ لوگ ہر مذہب کی آسانیاں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر اپنی خواہشات نفس کے مطابق ان پر عمل کرلیا کریں گے، حلال وحرام اور واجب وجائز کے احکام کا سارا اختیار خود لوگوں کو مل جائے گا اور بالآخر شرعی احکام کی پابندیاں بالکل کھل کر رہ جائیں گی، البتہ پہلے زمانے میں تقلید شخصی اس لئے ممکن نہ تھی کہ فقہی مذاہب مکمل طور پر مدون اور معروف نہ تھے (لیکن اب جب کہ مذاہب فقہیہ مدون اور مشہور ہو چکے) ہر شخص پر لازم ہے کہ وہ کوشش کرکے ایک مذہب کو اختیار کرلے اور پھر متعین طور پر اسی کی تقلید کرے کرے۔

---

[1] المجموع شرح المہذب جلد ۱ ص ۹۱ بحوالہ تقلید کی شرعی حیثیت :۔

امام نووی رح نے جو یہ فرمایا کہ اگر آدمی کو یہ اختیار دے دیا جائے کہ وہ جب چاہے جس مجتہد کا قول اپنا لیا کرے، تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ حلال و حرام ایک ہو جائیں اور احکام شرعیہ کی پابندیوں سے آدمی بالکل ہی آزاد ہو جائے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ :

"عہد صحابہ کرام رض سے اب تک بے شمار فقہاء و مجتہدین پیدا ہوئے اور اہل علم پر یہ بھی پوشیدہ نہیں، کہ ہر فقیہ کے مذہب میں کچھ ایسی آسانیاں ملتی ہیں جو دوسرے کے یہاں نہیں ہیں۔ اور یہ حضرات کچھ معصوم بھی نہیں تھے کہ اغلاط سے محفوظ ہی رہتے بلکہ ہر ایک کے یہاں دو ایک چیزیں ایسی بھی مل جاتی ہیں۔ جو مسلک جمہور کے خلاف ہیں تو اگر تقلید مطلق کی اجازت عام دے دی جائے تو خواہشات کے پیرو حضرات ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ایسے مسائل نکالیں اور ان کی تقلید کر کے دین فطرت کو احکام خداوندی نہیں بلکہ خواہشات نفسانیہ کا مجموعہ بنا دیں مثلاً فقہ شافعی میں جواز شطرنج کا قول ہے عبداللہ بن جعفر کی طرف منسوب ہے کہ وہ غناء و مزامیر کے جواز کے قائل تھے" [1]

حضرت قاسم ابن محمد سے منقول ہے کہ :

"وہ بے سایہ تصویروں کو جائز قرار دیتے تھے" [2]

امام اعمش کی طرف منسوب ہے کہ :

ان کے نزدیک ابتدائے صوم طلوع فجر کے بجائے طلوع آفتاب سے ہوتی ہے.....

..... چنانچہ تفسیر روح المعانی میں علامہ آلوسی رح نے روزے کا مسئلہ بیان کرنے کے بعد اعمش کا یہ مذہب بڑے لطیف پیرائے میں بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں :

"خالف ذالك الاعمش ولا يتبعه الا الاعمى" [3]

---

[1] اتحاف الزبیدی جلد ۶ ص ۴۵۸ بحوالہ تقلید کی شرعی حیثیت ص ۶۷۔

[2] نووی شرح مسلم جلد ۲ ص ۱۹۹۔ [3] روح المعانی جلد ۲ ص ۱۸۷۔

اس مسئلہ کی اعمش نے مخالفت کی ہے حالانکہ ان کی بات کوئی اندھا ہی تسلیم کر سکتا ہے۔

داؤد ظاہری رح اور ابن حزم رح کا مسلک یہ ہے کہ :

"اگر کسی عورت سے نکاح کا ارادہ ہو تو اسے برہنہ دیکھنا بھی جائز ہے" [1]

اب ایک خواہش نفس کے ہاتھوں اندھا انسان تقلید مطلق کی اجازت پاکر اپنی ان تمام مرغوبات کو بآسانی تلاش کر لے گا اور تقلید کے پردے میں دین و شریعت کو ایک افسانۂ رنگا رنگ بنا دے گا اور بقول حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رح کان شر عباد اللہ بدترین بندگان خدا میں شامل ہو جائے گا۔

علامہ شاطبی رح فرماتے ہیں :

لو فتح لهم هذا الباب لانحلت عُرى المذهب [2]

اگر لوگوں کے لئے (تقلید مطلق) کا دروازہ کھول دیا جائے تو مذہب کی چولیں ہل جائیں گی۔

علامہ ابن تیمیہ رح تقلید مطلق کے مفاسد بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

وفي وقت يقلدون من يبيحه وفي وقت يقلدون من يصححه بحسب الغرض والهوى ومثل هذا لا يجوز باتفاق الامة۔

یہ لوگ اپنی غرض اور خواہش نفسانی کے لئے ایک وقت اس کی تقلید کرتے ہیں جو فاسق گواہوں کے ذریعہ منعقدہ نکاح کو فاسد قرار دیتا ہے۔ اور دوسرے وقت اُس کی تقلید کرتے ہیں جو اسے صحیح کہتا ہے یہ باتفاق امت ناجائز ہے۔

چند سطروں کے بعد پھر لکھتے ہیں :

ونظير هذا ان يعتقد الرجل ثبوت شفعة الجوار اذا كان طالبًا لها و

اس کی نظیر یہ ہے کہ کوئی آدمی جس وقت کسی حق شفعہ کا خود طالب ہو (مذہب امام ابو حنیفہ رح کے

---

[1] فتح الملہم ج ۳ ص ۴۷۶ ؛ [3] الموافقات ج ۴ ص ۱۴۶ ؛

[2] عقد الجید ص ۶۲ ؛

عدم ثبوتها اذا كان مشتريا فان هذا لا يجوز بالاجماع وكذا من بنى صحة ولاية الفاسق فى حال نكاحه وبنى على فساد ولايته حال طلاقه لم يجز ذالك باجماع المسلمين ولو قال المستفتى العين انا لم اكن اعرف ذالك وانا اليوم التزم ذالك لم يكن من ذالك لان ذالك يفتح باب التلاعب بالدين ويفتح الذريعة ان يكون التحريم والتحليل بحسب الاهواء[1]

مطابق) شفعہ جواز کے ثبوت کا اعتقاد ظاہر کرے اور اگر مشتری ہو، اور دوسرا شخص طالب شفعہ ہو تو (مذہب امام شافعی رح کے مطابق) اس کے عدم ثبوت کا معتقد بن جائے۔ یہ بالاجماع جائز نہیں۔ ایسے ہی وہ شخص جو بحالت قیام نکاح ولایت فاسق کی صحت کا قائل ہو (اور اس کی بنا پر منافع نکاح سے منتفع ہو) مگر جب طلاق ثلثہ دیدے تو حرمتِ غلیظہ سے بچنے کے لئے ولایت فاسق کو کالعدم کہہ کر اس کے ماتحت منعقد شدہ نکاح کو فاسد قرار دے، یہ باجماعِ مسلمین جائز نہیں، اگر کوئی مستفتی

یہ کہے کہ پہلے مجھے اس مذہب کی خبر نہ تھی اور اب میں اس کا معتقد اور پابند ہوں تو بھی اس کا قول قابل تسلیم نہ ہوگا، کیوں کہ یہ دین کو ایک کھلونا بنانے کا دروازہ کھولنا ہے اور اس کا سبب بننا ہے کہ حلال وحرام کا مدار محض خواہشاتِ نفس پر ہوجائے۔

انھیں مفاسد عظیمہ کے پیش نظر علماء امت نے یہ فیصلہ فرمادیا کہ اب تقلید شخصی ہی واجب ہے تاکہ انسان نفس وہوی کے مکائد سے محفوظ ومامون ہوکر شریعت غرّا کی مکمل اتباع کے ساتھ زندگی گذار سکے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ رقمطراز ہیں:

واعلم ان الناس كانوا فى المائة الاولى والثانية غير مجتمعين على

یاد رکھئے کہ پہلی دوسری صدی میں تمام لوگ کسی ایک معین مذہب کی تقلید پر مجتمع نہیں

---

[1] فتاوی ابن تیمیہ ج ۲ ص ۲۴۱۔

التقليد بمذهب واحد بعينه ..... وبعد المائتين ظهر فيهم التمذهب للمجتهدين باعيانهم وقل من كان لايعتمد على مذهب مجتهد بعينه وكان هذا هو الواجب فى ذالك الزمان[1]

تھے ..... اور دوسری صدی کے بعد ان میں ایک مجتہد کو متعین کر کے اسی کے مذہب پر عمل کرنے کا رواج ہوا یہاں تک کہ اس وقت ایسے لوگ بہت کم ہوں گے جو کسی ایک مجتہد کے مذہب پر اعتماد نہ کرتے ہوں اور اس زمانے میں یہی چیز واجب تھی۔

صاحب انتصار الحق رح فرماتے ہیں :

"زمانہ ائمہ مجتہدین میں مذاہب مدون ہو گئے اور مذہب ہر مجتہد کا حوادث ضروریہ مقلدین کو جامع ہو گیا اور نفوس پر اتباع ہوا غالب آیا اس سبب سے تعین تقلید کو واجب کیا کہ بغیر اس کے ادائے احکام الٰہیہ عوام الناس کو بہت دشوار ہے چنانچہ اس مضمون کو خیر الدین ابی الفتح بغدادی نے کتاب الاصول میں مصرح فرمایا ہے[2]

دوسری جگہ علامہ شعرانی رح کے حوالہ سے فرماتے ہیں :

قال الشعرانى فى الميزان فان قلت فهل يجب على المحجوب عن الاطلاع على المعين الاولى للشريعة التقليد بمذهب معين فالجواب نعم وذالك لئلا يدخل فى نفسه ويدخل غيره[3]

علامہ شعرانی رح میزان میں فرماتے ہیں "اگر تم یہ سوال کرو کہ کیا شریعت کے اصل سرچشمہ کی اطلاع سے محروم شخص کیلئے تقلید معین واجب ہے تو جواب یہی ہے کہ ہاں واجب ہے اور یہ اس لئے کہ تاکہ وہ خیال اور مضل نہ بن سکے۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ بڑی تفصیل کے ساتھ تقلید معین کے فوائد اور تقلید مطلق کے مفاسد پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :

---

[1] الانصاف ص ۵۷-۵۹ ؛ [3] انتصار الحق ص ۲۱۹ ؛

[2] انتصار الحق بجواب معیار الحق ص ۱۵۳ ؛

"گو فی نفسہ یہ بھی جائز ہے کہ مختلف لوگوں کا اتباع ہو، مثلاً کسی شیخ سے کوئی شغل پوچھ لیا، اور کسی دوسرے سے اور کوئی شغل پوچھ لیا، تو اس طرح متعدد کا اتباع بھی فی نفسہ جائز ہے اور سلف کی یہی حالت تھی کہ کبھی امام ابوحنیفہ رح سے پوچھ لیا، کبھی اوزاعی رح سے۔ اور سلف کی اسی حالت کو دیکھ کر آج بھی لوگوں کو یہ لالچ ہوتا ہے سو فی نفسہ تو یہ جائز ہے، مگر ایک عارض کی وجہ سے ممنوع ہوگیا۔ اس کو سمجھنے کے لئے ایک مقدمہ سن لیجئے وہ یہ کہ ..... حالتِ غلبہ کا اعتبار ہوتا ہے، سو حالت غلبہ کے اعتبار سے آج میں اور اس وقت میں یہ فرق ہے کہ اس دن کے لوگوں میں تدیّن غالب تھا، ان کا مختلف لوگوں سے پوچھنا یا تو اتفاقی طور پر ہوتا ہے اور یا اس لئے کہ جس قول میں زیادہ احتیاط ہوگی اس پر عمل کریں گے، پس اگر تدیّن کی وہی حالت اب بھی ہوتی تو ایک کو خاص کر کے اور اس کی تقلید کرنے کی ضرورت نہ تھی، مگر اب تو وہ حالت ہی نہ رہی اور کیسے رہتی۔ حدیث میں ہے ثم یفشو الکذب، کہ خیر القرون کے بعد کذب پھیل جائے گا، اور لوگوں کی حالت بدل جائے گی۔ سو جتنا خیر القرون سے بعد ہوتا گیا اتنی ہی لوگوں کی ابتری ہوتی گئی، اب تو وہ حالت ہوگئی ہے کہ عام طور پر غرض پرستی غالب ہے، اب مختلف لوگوں سے اس لئے پوچھا جاتا ہے کہ جس میں اپنی غرض نکلتی ہو اس پر عمل کریں گے، ہمارے وطن کے قریب ایک قصبہ ہے۔ وہاں کے ایک مرد کا ایک عورت سے نکاح ہوا۔ پھر بعد میں معلوم ہوا کہ ان دونوں نے ایک عورت کا دودھ پیا تھا۔ ایک شخص میرے پاس دریافت کرنے آئے کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ میں نے کہا، ان کا نکاح جائز نہیں۔ ان میں جدائی کرادو۔ کہنے لگے اس میں تو بڑی بدنامی، اب تو کوئی صورت جواز کی نکال ہی دیجئے۔ میں نے کہا کہ اول تو تفریق میں بدنامی نہیں بلکہ تفریق نہ کرنے میں کہ لوگ کہیں گے ..... کہ بھائی بہن کو جمع کر رکھا ہے۔ دوسرے اگر ہو تو ہوا کرے جب شریعت کا حکم ہے تو بدنامی کا کچھ خیال نہیں کیا جا سکتا۔ کہنے لگے اس نے تو پگڑی اگل بھی دیا تھا۔ میں نے کہا خواہ اگلا ہو یا نہ اگلا ہو حرمت کے حق میں یکساں ہے

جب میرے پاس انہیں جواب ملا تو وہ دہلی پہونچے، وہاں ان کو ایک عامل بالحدیث مل گئے۔ مجھے اس وقت ان پر طعن کرنا منظور نہیں ہے بلکہ اس شخص کی غرض پرستی بیان کرنی ہے کہ اپنی غرض حاصل کرنے کے لئے ایک عامل بالحدیث کے پاس گیا، کہ شاید یہاں کوئی بات مل جائے۔ اس نے کہا کہ اگر پانچ گھونٹ سے کم پیا ہے تو حرمت ثابت نہیں ہوگی، پس آپ نے ایک استفتاء تجویز کیا کہ ایک لڑکے نے ایک عورت کا دودھ دو گھونٹ پیا تھا حرمت ثابت ہوئی یا نہیں۔ انہوں نے جواب لکھ دیا: لاتحرم المصّة والمصّتان۔ اب بہت خوش ہوئے اور ان میاں بیوی کو وہ فتویٰ لاکر دے دیا کہ یہ بھی تو عالم ہی کا فتویٰ ہے اس پر عمل کر لیا جائے گا تو کونسی خرابی ہے۔ آج کل لوگوں میں ایسی غرض پرستی ہے، بھلا اس سے کوئی پوچھے کہ بندۂ خدا! تو کیا گن رہا تھا کہ اس نے دو گھونٹ پیے تھے۔ اور بالفرض اگر اس کی تعداد معلوم بھی ہو تو اس کی وجہ سے ان کے فتوے کو تو مانا جنہوں نے حلال بتایا، اور ان کے فتوے کو نہ مانا جنھوں نے حرام بتایا، حالانکہ جنھوں نے حلال بتایا یہ شخص ان کا ہم مذہب بھی نہ تھا۔ ہاں اگر اول ہی سے اس کا وہی مذہب ہوتا تو مضائقہ نہ تھا۔ مگر اول تو یہ شخص ان کے مذہب پر نہ تھا جب دیکھا کہ ان کے مذہب سے اپنا کام نکلتا ہے تو ان کا مذہب لے لیا۔ سو اس نے دین پر دنیا کو ترجیح دی، اور افسوس ہے کہ بعضے اہل علم کو بھی اس میں شبہ ہو گیا کہ اس میں کیا حرج ہے کہ ایک مجتہد فیہ مسئلہ میں دوسرے امام کے مذہب پر عمل کر لیا جاوے، مگر حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کا فیصلہ فرما دیا ہے کہ انما الاعمال بالنیات کہ نیت کا اعتبار ہے، سو آج کل دوسرے امام کے مذہب پر دین ہونے کی حیثیت سے عمل نہیں کیا جاتا ہے بلکہ اپنی دنیوی غرض کے حاصل کرنے کے لئے ایسا کرتے ہیں۔

علامہ شامی رح نے ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک فقیہ نے ایک محدث کے یہاں اس کی لڑکی کے لئے پیغام بھیجا۔ اس نے کہا کہ اس شرط پر نکاح کرتا ہوں کہ رفع یدین اور آمین

بالجہر کیا کرو' فقیہ نے اس شرط کو منظور کر لیا' اور نکاح ہوگیا' اس واقعہ کو ایک بزرگ کے پاس ذکر کیا گیا تو انھوں نے اس کو سن کر سر جھکا لیا اور تھوڑی دیر سوچ کر فرمایا' مجھے اس شخص کے ایمان جاتے رہنے کا خوف ہے، اس واسطے کہ جس بات کو وہ سنت سمجھ کر کرتا تھا۔ بدون اس کے کہ اس کی رائے کسی دلیل شرعی سے بدلی ہو صرف دنیا کے لئے اس کو چھوڑ دیا۔ لوگوں کی یہ حالت دنیا طلبی کی ہوگئی ہے۔ ایسے وقت میں اگر تقلید شخصی نہ ہو تو یہ ہوگا کہ ہر مذہب میں سے جو صورت اپنے مطلب کی پاویں گے اختیار کریں گے۔ مثلاً اگر وضو کرنے کے بعد اس کے خون نکل آیا تو اب امام ابو حنیفہ رح کے مذہب پر وضو ٹوٹ گیا اور امام شافعی رح کے مذہب پر نہیں ٹوٹا' سو یہاں یہ تو شخص شافعی مذہب اختیار کرلے گا اور پھر اس نے بیوی کو بھی ہاتھ لگایا' تو شافعی رح کے مذہب پر وضو ٹوٹ گیا' اور امام ابو حنیفہ رح کے مذہب پر نہیں ٹوٹا تو یہاں حنفیہ کا مذہب لے لے گا۔ حالانکہ اس صورت میں کسی امام کے نزدیک وضو نہیں رہا۔ امام ابو حنیفہ رح کے نزدیک تو خون نکلنے کی وجہ سے وضو ٹوٹ گیا۔ اور امام شافعی رح کے نزدیک عورت کے چھونے کی وجہ سے۔ مگر اس شخص کو ذرا پرواہ نہ ہوگی' ہر امام کی رائے کو وہ اس میں قبول کرے گا' جو اس کے مطلب کے موافق ہے اور جو اس کے مطلب کے خلاف ہے اس کو نہ مانے گا۔ سو دین تو رہے گا نہیں غرض پرستی رہ جائے گی۔ پس یہ فرق ہے ہم میں اور سلف میں۔ ان کو تقلید شخصی کی ضرورت نہ تھی کیوں کہ ان میں تدین غالب تھا۔ اور سہولت اور غرض کے طالب نہ تھے۔ بخلاف ہمارے کہ ہم میں غرض پرستی غالب ہے ہم سہولت اور غرض کے بندے ہیں اس لئے ہم کو اس کی ضرورت ہے کہ کسی خاص ایک شخص کی تقلید کریں۔ ہم تقلید شخصی کو فی نفسہ واجب یا فرض نہیں کہتے ہیں بلکہ یوں کہتے ہیں کہ تقلید شخصی میں دین کا انتظام ہوتا ہے ترک تقلید کی حالت میں اگر تمام مذاہب سے احوط کو تلاش کر کے عمل کرے گا تو مصیبت میں رہے گا اور اگر آسان کو تلاش کرے گا تو غرض پرستی میں مبتلا ہو جائے گا۔ پس تقلید میں راحت بھی ہے اور نفس کی حفاظت بھی ہے اور جیسا کہ مجتہدین کی تقلید شخصی

میں یہ حکمت ہے۔ اسی طرح اس مذہب کے علماء اخیار میں سے ایک ہی کو متعین کر لینے میں یہی حکمت ہے کیونکہ زمانہ کی حالت بدل گئی ہے کہ لوگوں پر غرض پرستی غالب ہے اور ایک مذہب کے علماء میں بھی آپس میں مسائل کے اندر اختلاف ہے پس اگر ایک عالم کو متعین نہ کیا جائے گا تو اس کے اندر بھی اندیشہ ہے کہ کہیں غرض پرستی میں پڑ جاویں کہ جس عالم کی رائے نفس کے موافق ہوئی اس کو مان لیا اور جس کی رائے نفس کے خلاف ہوئی اس کو نہ مانا" [1]

صاحبؒ اعلاء السنن فرماتے ہیں :

وبهذا تبين سر ما ذهب اليه الفقهاء من عدم جواز ترك مذهب الى مذهب لان هذا ان كان على وجه التخطية للمذهب المتروك فهو ليس باهل لها وان كان على وجه الترجيح فهو الينا ليس من اهله فلا وجه للانتقال الا لهوى او شئ لا يعتد به فلا يجوز لا سيما اذا كان هذا الصنيع يفتح عليه باب اتباع الشهوات [2]

ایک مذہب سے دوسرے مذہب کی طرف عدول کے عدم جواز کے سلسلہ میں فقہاء کے نظریہ کا راز اس سے ظاہر ہو گیا کیوں کہ یہ چیز اگر مذہب متروک کو غلط قرار دینے کی وجہ سے ہو تو وہ آدمی اس کا اہل نہیں ہے اور اگر بر بنائے ترجیح ہو تو وہ شخص اس کا بھی اہل نہیں۔ تو اب انتقال مذہب کی وجہ بجز خواہش پرستی اور فضول کے کچھ اور نہ ہوگی تو یہ چیز جائز نہ ہوگی، خصوصاً جب کہ اس سے اتباع شہوات کے دروازے کھلتے ہوں۔

علامہ شبیر احمد عثمانی صاحبؒ فرماتے ہیں :

"الغرض اتباع ہوی باجماع امت حرام ہے اور ادھر یہ بات تجربہ سے محسوس ومشاہد ہے کہ اگر عوام کو آزاد چھوڑ دیا جائے کہ جس مسئلہ میں چاہیں ابوحنیفہؒ کے مذہب پر عمل کریں اور جس میں چاہیں شافعیؒ کے مذہب پر، پھر جب چاہیں مالکیہ کا قول

---

[1] اشرف الجواب حصہ دوم صـ ۱۲۲ ۔ [2] مقدمہ اعلاء السنن جلد ۱ صـ ۶۴ ۔

لے لیں، اور جب چاہیں حنابلہ یا دوسرے ائمۂ مجتہدین کا، تو انجام اس کا لازمی طور پر وہی ہوگا جس کو حافظ ابن تیمیہ رح نے باجماع مسلمین حرام اور ناجائز قرار دیا ہے۔ اس شرعی مصلحت کی بناء پر عافیت اسی میں دیکھی گئی کہ امام واحد کا اتباع تمام مسائل میں لازم قرار دیا جائے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اصل مقصود اتباع ہوئی سے بچنا ہے اور چونکہ اسکی تدبیر اس ہوئی پرستی کے زمانے میں اس کے سوا کچھ نہیں کہ عمل کرنے والوں کو آزاد نہ چھوڑا جائے بلکہ امام واحد کی تقلید پر مجبور کیا جائے۔ اس لئے تقلید شخصی بوجہ ذریعہ مقصود ہونے کے واجب قرار دی گئی"[1]

ترک تقلید کے قبیح نتائج کا اعتراف کرتے ہوئے خود غیر مقلد حضرات کے پیشوا مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی رح اپنے رسالہ "اشاعۃ السنہ" جلد ۱۱ شمارہ ۱۱ صـ ۵۳ میں تحریر فرماتے ہیں:

"پچیس برس کے تجربہ کے بعد سے ہم کو یہ بات معلوم ہوئی کہ جو لوگ بے علمی کے ساتھ مجتہد مطلق اور تقلید کے تارک بن جاتے ہیں وہ بالآخر اسلام کو سلام کر بیٹھتے ہیں، ان میں سے بعض عیسائی ہو جاتے ہیں اور مذہب لا مذہب جو کسی دین و مذہب کے پابند نہیں رہتے اور احکام شریعت سے فسق و خروج تو اس آزادی کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔ ان فاسقوں میں بعض تو کھلم کھلا جمعہ جماعت اور نماز، روزہ چھوڑ بیٹھتے ہیں، سود شراب سے پرہیز نہیں کرتے اور بعض جو کسی مصلحت دنیاوی کے باعث فسق ظاہری سے بچتے ہیں وہ فسق خفی میں سرگرم رہتے ہیں، ناجائز طور پر عورتوں کو نکاح میں پھنسا لیتے ہیں، کفر و ارتداد اور فسق کے اسباب دنیا میں اور بھی بکثرت موجود ہیں، مگر دینداروں کے بے دین ہو جانے کا بہت بڑا سبب یہ بھی ہے کہ وہ علم کی کمی کے باوجود تقلید چھوڑ بیٹھتے ہیں"[2]

مقلد اور غیر مقلد دونوں قسم کے علماء کرام کی ان تصریحات سے یہ بات واضح ہو گئی۔

---

[1] جواہر الفقہ حصہ اول صـ ۱۵۳،

[2] بحوالہ سبیل الرشاد مصنفہ حضرت گنگوہی رح صـ ۹۔

کہ تقلید شخصی سے انحراف کرنا طرح طرح کے فتنہ و فساد کے دروازے کھول دیتا ہے۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی تقلید شخصی کے وجوب کو تسلیم نہ کرے تو اس کی بنیاد صرف دو چیزیں ہو سکتی ہیں۔

۱: یا تو وہ شخص اتباع ہوئی اور خواہشات نفس کی پرستش میں مبتلا ہے جس کی مثالیں گذشتہ صفحات میں گذر چکی ہیں۔

۲: یا وہ شخص صلاحیت اجتہاد سے تہی دامن ہونے کے باوجود اپنے آپ کو مجتہد سمجھتا ہے۔

اور یہ دونوں چیزیں نہایت خطرناک اور امت مسلمہ کو راہ خیر اور صراط مستقیم سے محروم کر کے فساد و شر کی مختلف راہوں میں بکھیر دینے والی ہیں، اس حقیقت کو مکمل وضاحت کے ساتھ ذہن نشین کرنے کے لئے اختلاف امت کے اقسام اور اس کے اسباب پر ایک تفصیلی نظر ڈالنی مناسب ہے

اختلافِ امّت

قرآن و سنت میں بصراحت امت کے افتراق و انتشار کی خبر دی گئی ہے اور ساتھ ہی ساتھ حق و باطل کے درمیان امتیاز کرنے والے معیار صحیح کی بھی نشاندہی کی گئی ..... علماء کرام نے افتراق امت کے مختلف اسباب بڑی شرح و بسط کے ساتھ بیان کئے ہیں جن کی بنیاد پر جادۂ حق سے منحرف ہونے والے تمام فرقوں کو تعیین و تفہیم نیز راہ حق کی توضیح و تفسیر میں بصیرت اور اطمینان کلی کا سرمایہ حاصل ہوتا ہے ..... ارشاد ربانی ہے:

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ؛ (سورۂ انعام پ ۸ ع ۱۵۴)

اور یہ میرا سیدھا راستہ ہے تو تم لوگ اسی کی اتباع کرو، اور مختلف راستوں کی اتباع نہ کرو، ورنہ تم کو یہ چیز اللہ کے راستہ سے پھیر دے گی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

عن ابی هریرة رضی الله عنه ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال تفرقت الیهود علی احدی وسبعین فرقة او ثنتین وسبعین فرقة والنصاریٰ مثل ذلك وتفترق امتی علی ثلث وسبعین فرقة [1]

ابوہریرہ رضؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، یہود اکہتر یا بہتر فرقوں میں تقسیم ہوگئے تھے، اور نصاریٰ کا بھی یہی حال ہوا اور میری امت تہتر فرقوں میں تقسیم ہوجائیگی۔

ترمذی کی دوسری روایت میں مزید تفصیل ہے :

وان بنی اسرائیل افترقت علی ثنتین وسبعین ملة وتفرق امتی علی ثلث وسبعین ملة کلهم فی النار الا ملة واحدة قالوا ومن هی یارسول الله ؟ قال ما انا علیه واصحابی [2]

بے شک بنی اسرائیل بہتر ملتوں میں منقسم ہوگئے اور میری امت تہتر ملتوں میں منقسم ہوجائے گی : اور ایک ملت کے علاوہ سب کے سب جہنم میں جائیں گے۔ صحابہ رضؓ نے سوال کیا، اے اللہ کے رسولؐ وہ (جنتی) کون ہوں گے، آپؐ نے فرمایا جو میرے اور میرے صحابہ کے راستہ پر ہوں گے۔

ان نصوص میں جس افتراق کی خبر دی گئی ہے وہ نظریات اور معتقدات کے مختلف ہوجانے کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔

" والتفرق ناشئ عن الاختلاف فی المذاهب والآراء " [3]

اختلاف کے پیرائے مختلف ہوتے ہیں لیکن وہ عموماً تین بنیادوں پر ہوتا ہے۔

---

[1] جامع الترمذی ص ۱۸۰ جلد ۲ ؛

[2] " " " ص ۸۹ " ؛

[3] الاعتصام ص ۳ جلد ۳ ؛

اختلاف کی پہلی قسم :

یہ ہے کہ دین کے اصول اور کلیات ہی کے سلسلہ میں رائیں مختلف ہو جائیں ۔

علامہ شاطبی رح فرماتے ہیں کہ :

واصل هذا الاختلاف هو في التوحيد والتوجه للواحد الحق سبحانه فان الناس في عامة الامر لو يختلفوا في ان لهم مدبرا يدبرهم ومخالقا اوجدهم الا انهم اختلفوا في تعيينه على آراء مختلفة من قائل بالاثنين وبالخمسة وبالطبيعة او بالدهر او بالكواكب الى ان قالوا بالآدميين وبالشجر وبالحجارة وما يخترعون بايديهم [1]

دراصل یہ اختلاف توحید اور ذات واحد کی طرف توجہ کے سلسلہ میں پیدا ہوا، لوگوں میں عموماً اس چیز کے اندر اختلاف نہیں ہوا کہ ان کے لئے کوئی مدبر ہے جو ان کے معاملات کی تدبیر کرتا ہے، یا کوئی خالق ہے جس نے ان کو پیدا کیا بلکہ انھوں نے خالق کی تعیین کے سلسلہ میں اختلاف کیا، کوئی دو کا قائل ہوا کوئی پانچ کا، یا پھر طبیعت کا یا دھر یا کواکب کی خالقیت کا اعتقاد رکھا، یہاں تک کہ بعض لوگ آدمیوں، درختوں، پتھروں اور خود ترشیدہ چیزوں کو خالق مان بیٹھے ۔

آیت کریمہ :

ولا يزالون مختلفين الا من رحم ربك ولذلك خلقهم ،

اور یہ لوگ برابر اختلاف کرتے رہے مگر وہ لوگ جن پر تیرے رب نے رحم کیا اور اللہ نے ان کو اسی لئے پیدا کیا ۔

انہیں لوگوں کے سلسلے میں وارد ہوئی ہے، یہ لوگ رحمت خداوندی اور ہدایت ربانی سے سراسر محروم ہیں ۔

---

[1] الاعتصام جلد ۲ صـ ۵ ۔

علامہ شاطبی رح تحریر فرماتے ہیں :

ومنهم من اقر بواجب الوجوب الحق لكن على آراء مختلفة ايضاً الى ان بعث الله تعالىٰ الانبياء مبينين لامهم حق ما اختلفوا فيه من باطله على ما ينبغي وتنزهوا رب الارباب عما لا يليق بجلاله من نسبة الشركاء والانداد واضافة الصاحبة والاولاد فاقر بذالك من اقر به وهم الداخلون تحت مقتضىٰ قوله "الا من رحم ربك" وانكر من انكر فصار الى مقتضىٰ قوله "وتمت كلمة ربك لاملأن جهنم من الجنة والناس اجمعين" وانما دخل الاولون تحت وصف الرحمة لانهم خرجوا عن وصف الاختلاف الى وصف الوفاق والالفة وهو منقول عن جماعة من المفسرين وخرج ابن وهب عن عمر ابن عبد العزيز انه قال فى قوله تعالىٰ "ولذالك خلقهم" خلق اهل الرحمة ان لا يختلفوا وهو معنى ما نقل عن مالك وطاؤس فى جامعه

ان میں سے بعض نے واجب الوجوب تعالے کا اقرار کیا، لیکن ان کی رائیں مختلف رہیں یہاں تک کہ اللہ تعالے نے انبیاء کرامؑ کو مبعوث فرمایا جنھوں نے اپنی امتوں کے سامنے مختلف فیہ چیزوں میں حق اور باطل کو مکمل واضح فرمایا اور رب العالمین کی شرکاء انداد بیوی اور اولاد اور ان تمام چیزوں سے تنزیہہ فرمائی جو جلالت خداوندی کے شایان شان نہ تھیں، تو تسلیم کرنے والوں نے اس کو تسلیم کیا، اور یہی وہ لوگ جو "الا من رحم ربك" کے تحت داخل ہیں۔ اور منکرین نے انکار کیا اور تمت کلمة الخ (آپ کے رب کا فیصلہ پورا ہو چکا کہ ہم ضرور بالضرور ایسے انسانوں اور جناتوں کو جہنم میں داخل کر دیں گے) کے مصداق ہو گئے پہلے لوگ رحمت سے اس لئے ہمکنار ہوئے کہ وہ اختلاف سے بچ کر اتفاق اور الفت اختیار کرنے والے تھے۔ مفسرین کرام کی ایک جماعت سے آیت کی یہی تفسیر منقول ہے۔ ابن وہب نے آیت کریمہ "ولذالك خلقهم" کی تفسیر میں عمر ابن عبد العزیز کا قول نقل کیا ہے کہ اللہ تعالے نے اہل رحمت کو اسی لئے پیدا ہی کیا ہے کہ وہ اختلاف سے

وبقی الآخرون علی وصف الاختلاف اذ خالفوا الحق الصریح ونبذوا الدین الصحیح ۔[1]

دور رہیں، یہی معنی مالک اور طاؤس سے بھی منقول ہیں اور بقیہ لوگ حق صریح کی مخالفت اور دین صحیح کو پس پشت ڈالنے کی وجہ سے صفتِ اختلاف ہی پر رہے۔

اختلاف کی دوسری قسم :

بعض دفعہ اختلاف اصول وکلیات کے بجائے جزئیات اور فروع کے اندر ہوتا ہے۔

ثم ان هؤلاء المتفقین قد یعرض لهم الاختلاف بحسب القصد الثانی لا القصد الاول" ۔[2]

پھر یہ کلیات دین میں متفق حضرات بعض دفعہ قصد ثانی یعنی جزئیات کے اعتبار سے اختلاف کر لیتے ہیں نہ کہ قصد اول یعنی کلیات کے اعتبار سے۔

یہ اختلاف مسائل اجتہادیہ میں ہوتا ہے جیسا کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور ائمہ عظامؒ کے اختلافات ۔۔۔۔۔۔۔۔ علامہ شاطبی رح فرماتے ہیں :

انا نقطع بان الخلاف فی مسائل الاجتهاد واقع ممن حصل لهم محض الرحمة وهم الصحابة ومن اتبعهم باحسان ۔[3]

ہم قطعی طور پر جانتے ہیں کہ مسائل اجتہادیہ میں اختلاف ان لوگوں میں بھی ہوا جو سراسر اہل رحمت ہیں یعنی صحابہ کرام رض اور ان کے سچے متبعین۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں :

ثم انهم تفرقوا فی البلاد وصار کل واحد مقتدی ناحیه من النواحی

(آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد) صحابہ کرام رض تمام بلاد میں پھیل گئے اور ہر شخص ایک ایک حصہ

---

[1] الاعتصام ص ۵-۶ جلد ۳ [3] الاعتصام ص ۱۰ جلد ۳ :۔

[2] " ص ۵ "

فكثرت الوقائع وداوت المسائل فاستفتوا فيها فاجاب كل واحد حسب ماحفظه اذا استنبط ما يصلح للجواب وان لم يجد فيما حفظه او استنبط ما يصلح للجواب اجتهد برأيه وعرف العلة التي ادار رسول الله صلى الله عليه وسلم عليها الحكم في منصوصاته فنظروا الحكم حيث وجدها لايألوا جهدا في موافقة غرضه عليه الصلوٰة والسلام فعند ذلك وقع الاختلاف بينهم[1]

کا مقتدا بن گیا، پس واقعات زیادہ پیش آتے گئے، اور لوگوں نے مسائل دریافت کرنے شروع کئے، ہر صحابی نے اپنی یادداشت اور استنباط کے موافق جواب دیا، اور اگر انھوں نے اپنی یادداشت اور استنباط میں کوئی امر قابل نہ پایا تو اپنی رائے سے اجتہاد کیا اور اسی علت کو معلوم کیا جس کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مصرح احکام میں مدار علیہ قرار دیا تھا، پس انہوں نے جہاں اس علت کو پایا وہیں اس کا حکم متعین کر دیا اور حکم کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی غرض کے مطابق کرنے میں کوئی کمی نہ کی، پس اس وقت ان کے درمیان اختلاف واقع ہوگیا۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں صحابہ کرامؓ اور ائمہ مجتہدین کے ان اختلافات کو بڑے لطیف اور نفیس انداز میں تفصیلاً بیان کیا ہے ——— اس نوع کے اختلاف کو کسی بھی طرح مذموم اور غیر مستحسن قرار نہیں دیا جا سکتا، بلکہ علمائے امت کی تصریحات کے مطابق یہ اختلاف امت کے لئے رحمت ہے:

ان جماعة من السلف الصالح جعلوا اختلاف الامة في الفروع رحمة..... روي عن قاسم بن محمد قال نفع الله باختلاف اصحاب رسول الله

سلف صالحین کی ایک جماعت نے فروع کے اندر امت کے اختلاف کو رحمت کہا ہے قاسم ابن محمد سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اصحاب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اختلافات

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ص ۳۳۲ جلد ۱

صلی اللہ علیہ وسلم فی العمل لایعمل العامل بعمل رجل منهم الاراى انه فی سعة .....
روی ابن وهب عن القاسم ایضاً قال لقد اعجبنی قول عمر ابن عبدالعزیز ما احب ان اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لایختلفون لانه لوکان قولا واحداً لکان الناس فی ضیق وانهم ائمة یقتدی بهم فلو اخذ رجل بقول احدهم کان سعة [1]

کو عمل کے اندر نفع بخش بنایا ہے، عمل کرنیوالا ان میں سے جس کے بھی طریقہ پر عمل کریگا اپنے کو وسعت کے اندر محسوس کریگا، نیز ابن وہب نے قاسم سے نقل کیا ہے کہ "مجھے عمر ابن عبد العزیز کا یہ قول بہت پسند آیا اور مجھے یہ بات پسند نہیں کہ صحابہ کرام رضؓ اختلاف نہ کرتے اس لئے کہ اگر ایک ہی قول ہوتا تو لوگ تنگی میں پڑتے....
صحابہ کرام چونکہ رہنما اور مقتدا ہیں اس لئے ان میں سے جس کا بھی قول اختیار کیا جائے سنت ہوگا۔

اختلاف کی تیسری قسم :

اختلاف کی ان دونوں صورتوں کے درمیان ایک تیسری صورت ہے کہ اصل دین میں اتفاق کے باوجود دین کے بعض قواعد کلیہ اور مسائل اساسیہ میں اختلاف رونما ہوجائے، جس کی بنیاد پر لوگ مختلف گروہوں اور فرقوں میں تقسیم ہوجائیں، یہ وہی اختلاف ہے جس کی خبر حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں دی ہے کہ "میری امت تہتر فرقوں میں تقسیم ہوجائیگی
علامہ شاطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :

وبین هذین الطریقین واسطة ادنیٰ من الرتبة الاولیٰ واعلیٰ من الرتبة الثانیة وهی ان تقع الاتفاق فی اصل

اور ان دونوں طریقوں کے درمیان ایک واسطہ جو پہلے سے کمتر اور دوسرے سے بدتر ہے وہ یہ ہے کہ اصل دین میں اتفاق کے

---

[1] الاعتصام ص ۱۱۱ جلد ۳

الذین ویقع الاختلاف فی بعض قواعدہ الکلیۃ وھو المؤدی الی التفرق شیعا ..... ولذا لما صح عنہ صلی اللہ علیہ وسلم ان امتہ تفرق علی بضع وسبعین فرقۃ [1]

باوجود دین کے بعض قواعد کلیہ میں اختلاف واقع ہوجائے اور یہی مختلف گروہ بندیوں کا سبب ہے، اسی بناء پر حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت الخ

امام ابواسحٰق ابراہیم ابن موسیٰ شاطبی رح نے اپنی مشہور ومستند کتاب "الاعتصام" اور شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رح نے اپنی مایۂ ناز کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" میں اسی اختلاف کے اسباب وعلل نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کئے ہیں، جن میں یہ دو سبب بہت اہم ہیں:

اختلاف کا پہلا سبب:

اختلاف کا پہلا سبب یہ ہے کہ آدمی اپنے کو صاحب علم وفضل اور مرتبۂ اجتہاد پر فائز خیال کرے اور فی الواقع اسے یہ درجہ حاصل نہ ہو: ..... علامہ شاطبی رح فرماتے ہیں:

احدھا ان یعتقد الانسان فی نفسہ او یعتقد فیہ انہ من اھل العلم والاجتھاد فی الدین ولم یبلغ تلک لدرجۃ..... فتراہ آخذاً ببعض جزئیات الشریعۃ فی ھدم کلیاتھا حتی یصیر منھا ما ظھر لہ فی بادی رأیہ من غیر احاطۃ بمعانیھا ولا رسوخ فی فھم مقاصدھا [2]

پہلا سبب اختلاف کا یہ ہے کہ آدمی خود اپنے کو اہل علم اور اہل اجتہاد سمجھے یا دوسرے لوگ اس کے بارے میں یہ خیال کریں حالانکہ اسے یہ درجہ حاصل نہ ہو، تم ایسے شخص کو دیکھو گے کہ بعض دفعہ وہ شریعت کے کسی ایسے جزیہ کو اختیار کرلیتا ہے جو اصل شریعت ہی کو منہدم کرنے والی ہوتی ہے، یہاں تک کہ وہ احکام شرعیہ کے معانی کا احاطہ اور مقاصد کا ادراک کئے بغیر ظاہر نظر میں سمجھ میں آنے والی چیزوں

---

[1] الاعتصام جلد ۳ صـ ۱۲،

[2] الاعتصام جلد ۳ صـ ۱۳-۱۵،

کو اختیار کرتا رہتا ہے

علم وفہم کی کمی کے باوجود اپنی رائے اور فیصلہ کو حرف آخر قرار دیتا ہے، قرآن وحدیث کے ضروری علوم استنباط واجتہاد کے واجبی شرائط پورے حاصل کئے بغیر احکام شرعیہ اور مسائل دینیہ میں رائے زنی کر کے زیغ وضلال اور افتراق وانتشار کے دروازے کھولتا رہتا ہے۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات میں اس روش پر شدید تنبیہ فرمائی ہے:

۱:۔ عن عبد اللہ بن عمر ابن العاص قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ لایقبض العلم انتزاعا ینتزعہ ولکن یقبض العلم بقبض العلماء حتی ان لم یبق عالم اتخذ الناس رؤسا جہالا فسئلوا فافتوا بغیر علم فضلوا واضلوا [1]

بے شک اللہ تعالیٰ علم نہیں اٹھائیں گے اس طور پر کہ دفعۃً بندوں سے چھین لیں۔ بلکہ علم اٹھائیں گے علماء کرام کو اٹھا کر یہاں تک کہ جب کوئی عالم باقی نہ رہ جائے گا تو لوگ جاہل رہنماؤں کو اپنالیں گے اور انھیں سے مسائل معلوم کئے جائیں گے اور یہ لوگ علم کے بغیر ہی جواب دے کر خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کردیں گے۔

۲: عن ابن عباسؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من قال فی القرآن بغیر علم فلیتبوا مقعدہ من النار [2] (رواہ ترمذی)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے قرآن کریم کے اندر بغیر علم کے رائے زنی کی وہ اپنا ٹھکانہ جہنم بنالے۔

۳: عن ابی ھریرہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من افتی

جس شخص کو غلط فتویٰ دیا گیا تو اس کا گناہ مفتی کے سر ہے۔

---

[1] البخاری کتاب العلم ص۲۰ جلد۱ ترمذی ابواب العلم ص۹۰ جلد۲ مسند حمیدی ص۲۶۵ جلد۱

[2] بحوالہ مشکوٰۃ کتاب العلم ص۳۳ جلد۱۔

بغیر علم کان اثمه علیٰ من افتاه [1] (رواہ ابو داؤد)

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور علمائے امت رح نے بھی دین میں جہلاء کی دخل اندازی کو منبع فتن قرار دیا ہے

قال ابن مسعود رضی الله عنه لایزال الناس بخیر ما اخذوا العلم من اکابرهم فاذا اخذوه من اصاغرهم وشرارهم هلکوا ..... قال الباجی یحتمل الاصاغر من لاعلم عنده [2]

ابن مسعود رض فرماتے ہیں، لوگ اس وقت تک خیر میں رہیں گے جب تک علم علماء سے حاصل کرتے رہیں اور جب چھوٹوں اور برے لوگوں سے علم حاصل کرنا شروع کر دیں گے تو ہلاکت میں پڑ جائیں گے .... باجی کہتے ہیں احتمال ہے کہ "چھوٹوں" سے مراد بے علم لوگ ہوں۔

وفی تفسیر ابن عباس وتفسیر سعید بن منصور "حتی لاعمر رضی الله عنه ذات یوم فجعل یحدث نفسه کیف تختلف هذه الامة ونبیها واحد ؟ فارسل الی ابن عباس رضی الله عنه فقال کیف تختلف هذه الامة ونبیها واحد وقبلتها واحد قال فقال ابن عباس رض یا امیر المومنین انما انزل علینا القرآن فقرأناه وعلمناه فیما انزل وانه سیکون بعدنا اقوام یقرؤن القرآن ولا یدرون فیما نزل فیکون بهم فیه رأی فاذا کان

ابن عباس اور سعید ابن منصور کی تفسیروں میں مروی ہے کہ ایک دن حضرت عمر رض تنہائی میں تھے اور غور کر رہے تھے کہ اس امت میں کیسے اختلاف واقع ہو جائے گا جب کہ امت کے نبی ایک ہیں، پھر ابن عباس رض کو طلب کیا اور ان سے سوال کیا کہ اس امت میں کیسے اختلاف واقع ہو جائے گا جب کہ اس امت کے نبی ایک ہیں اور قبلہ بھی ایک ہی ہے، تو ابن عباس رض نے کہا، اے امیر المومنین بے شک قرآن ہمارے زمانے میں نازل ہوا اور ہم نے اسے پڑھا اور اس کے مواقع نزول کو سمجھا، ہمارے بعد کچھ لوگ آئیں گے اور وہ

---

[1] بحوالہ مشکوٰۃ کتاب العلم ص ۳۵، [2] الاعتصام جلد ۳ ص ۱۶-۱۷۔

كذلك اختلفوا فاذا اختلفوا اقتتلوا [1]

قرآن پڑھیں گے لیکن اس کے مواقع نزول سے ناآشنا ہوں گے، قرآن میں خود اپنی ہی رائے پیش کریں گے، اور جب یہ صورت حال ہوگی تو اختلاف کریں گے اور جب اختلاف برپا ہوگا تو جدال وقتال تک کی نوبت آئے گی۔

حضرت شاہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:

ایضاً جہل روس الناس واستفتاء الناس من لاعلم له بالحدیث ولا بطریق التخریج کما تری ظاهرا فی اکثر المتاخرین وبنه علیه ابن همام وغیره وذلك الوقت سمی غیر المجتهد فقیهاً [2]

اور نیز ایک سبب یہ بھی تھا کہ حکام جاہل تھے اور لوگ ایسے لوگوں سے فتویٰ لیتے تھے جن کو نہ علم حدیث حاصل تھا اور نہ وہ تخریج کے طریقہ سے واقف تھے جیسا کہ اکثر متاخرین کی ظاہری حالت تم دیکھتے ہو، ابن ہمام وغیرہ نے اس پر تنبیہ کی ہے اور اس زمانے میں غیر مجتہد کو بھی فقیہ کہنے لگے تھے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

كتب سلمان رض الى ابى الدرداء رضى الله عنه وقد كان اخى بينهما رسول الله صلى الله عليه وسلم يا اخى بلغنى انك قعدت طبيبا تداوى المرضى فانظر فان كنت طبيبا فتكلم فان كلامك شفاء وان كنت متطببا فالله لاتقتل مسلما فكان ابو درداء

حضرت سلمان فارسیؓ نے حضرت ابو درداء کے پاس خط لکھا ان دونوں کے درمیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مواخاۃ قائم فرمایا تھا..... اے میرے بھائی مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ طبیب بن کر مریضوں کا علاج کرتے ہیں تو غور کر لیجئے اگر آپ واقعۃً طبیب ہوں تو گفتگو کیجئے آپ کا کلام باعث شفا

---

[1] الاعتصام جلد ۳ ص ۲۹-۳۰۔ [2] حجۃ اللہ البالغہ ص ۳۶۰ ج ۱

یتوقف بعد ذالك اذ سئل [1] ہوگا اور اگر آپ واقعی طبیب نہ ہوں، تو خدارا کسی مسلمان کو ہلاکت میں نہ ڈالئے۔ اس کے بعد حضرت ابو درداء رضؓ سے جب بھی کوئی سوال کیا جاتا تو وہ توقف کرتے تھے۔

اس عبارت سے مسائل علمیہ میں بصیرت کے بغیر رائے زنی کی سخت مذمت ثابت ہوئی، نیز اس سلسلہ میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے شدت احتیاط کا اندازہ ہوتا ہے۔

قال بعض اهل العلم لايوتون الناس قط من قبيل علمائهم وانما يؤتون من قبل انه اذا مات علماءهم افتى من ليس بعالم [2]

بعض اہل علم کا قول ہے کہ لوگوں پر افتاد علماء کی جانب سے کبھی بھی نہیں آتی لوگوں کے فتنہ میں مبتلا ہونے کا سبب محض یہ ہوتا ہے کہ علماء کے گذر جانے کے بعد جہلا ہی منصب فتوی پر فائز ہو جاتے ہیں

اختلاف کا دوسرا سبب :

۲: اختلاف امت کا دوسرا اہم سبب اتباع ہوی ہے یعنی کتاب وسنت کی تصریحات کو پس پشت ڈال کر آدمی خواہشات نفسانیہ کی راہ اختیار کر لیتا ہے اور اسی کو اپنا حاکم اور مقتدا بنا لیتا ہے۔ صاحب الاعتصام فرماتے ہیں :

والثانی من اسباب الاختلاف اتباع الهوی ولذالك سمی اهل البدع اهل الاهواء لانهم اتبعوا اهواءهم فلم یاخذوا الادلة الشرعية ماخذ الافتقار اليها والتعول عليها حتى يصدروا عنها بل قدموا اهواءهم

اختلاف کا دوسرا سبب اتباع ہوی ہے اسی وجہ سے اہل بدع کو اہل "اہواء" کہتے ہیں کیوں کہ انہوں نے اپنی خواہشات کی اتباع کی، اسی بناء پر ادلہ شرعیہ کو اپنے احتیاج کا مرکز نہیں قرار دیا، اور نہ ہی ان پر اعتماد کیا کہ ان کی طرف وہ میلان کرتے بلکہ اپنی خواہشات

---

[1] احیاء العلوم ص ۷۶/۱۲ ، [2] الاعتصام ص ۱۵ جلد ۳ ۔

واعتمدوا علی اٰراءھم ثم جعلوا الادلۃ الشرعیۃ منظوراً فیھا من وراء ذالک [1]

کو مقدم رکھا اور اپنی رایوں ہی پر اعتماد کیا اور شرعی پر ان کی نظر ثانوی درجہ کی رہی۔

قرآن وحدیث اور آثار سلف میں اتباع ھویٰ کو فساد وضلال کی اصل قرار دیا گیا ہے

قال اللہ تعالیٰ :

ھو الذی انزل علیک الکتاب منہ اٰیات محکمات ھن ام الکتاب واٰخر متشابہات فاما الذین فی قلوبھم زیغ فیتبعون ما تشابہ منہ ابتغاء الفتنۃ وابتغاء تاویلہ (سورۂ آل عمران پ۳)

وہ اللہ جس نے آپ پر کتاب اتاری اس میں سے بعض آیات محکمات ہیں وہی اصل کتاب ہیں، اور بعض دوسری متشابہ آیات ہیں تو وہ لوگ جن کے دلوں میں کجی ہے وہ پیروی کرتے ہیں متشابہات کی گمراہی پھیلانے کی غرض سے، اور مطلب معلوم کرنے کی وجہ سے۔

وقال اللہ تعالیٰ :

ومن اضل ممن اتبع ھواہ بغیر ھدیً من اللہ۔

(سورۂ قصص پ۲)

اور ایسے شخص سے زیادہ گمراہ کون ہوگا جو اپنی نفسانی خواہشات پر چلتا ہو بدون اسکے کہ منجانب اللہ کوئی دلیل ہو۔

وقال اللہ تعالیٰ :

ولا تتبع الھویٰ فیضلک عن سبیل اللہ

(سورہ صٓ پ۲۳)

خواہشات کی اتباع نہ کرو ورنہ وہ تم کو اللہ کے راستے سے گمراہ کردیں گی۔

وقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سیخرج فی امتی اقوام تتجاریٰ بھم تلک الاھواء کما تتجاری الکلب بصاحبہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت میں عنقریب ایسے لوگ ظاہر ہوں گے جن میں یہ خواہشات ایسے سرایت کرجائیگی

---

[1] الاعتصام جلد ۳ صـ ۱۹ ؛

حتی لایبقی منه عرق ولامفصل الادخله [1]

جیسے داء الکلب کا مرض اپنے مریض کے اندر سرایت کرجاتا ہے کہ کوئی رگ اور کوئی جوڑ اس کے اثر سے محفوظ نہیں رہتا۔

وفی صحیح مسلم عن عائشة ان النبی صلی الله علیه وسلم کان اذا قام من اللیل یصلی یقول اللهم رب جبرئیل ومیکائیل فاطر السموات والارض عالم الغیب والشهادة انت تحکم بین عبادك فیما کانوا فیه یختلفون اهدنی لما اختلف فیه من الحق باذنك انك تهدی من تشاء الی صراط مستقیم فمن خرج عن الصراط المستقیم کان متبعا لظنه ومانهواه نفسه ومن اضل ممن اتبع هواه بغیر هدیً من الله [2]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب رات کو نماز کے لئے اٹھتے تو فرماتے تھے، اے اللہ جبرئیل اور میکائیل کے رب، زمین وآسمان کے پیدا کرنے والے کھلی اور چھپی چیزوں کو جاننے والے آپ فیصلہ کریں گے اپنے بندوں کے درمیان ان چیزوں کا جن میں وہ اختلاف کرتے تھے، مجھے اپنے فضل سے اس حق کی ہدایت دیجئے جس میں اختلاف کیا گیا بے شک آپ جس کو چاہتے ہیں صراط مستقیم کی ہدایت دیتے ہیں، تو جو شخص صراط مستقیم سے نکل گیا وہ اپنے گمان اور نفسانی خواہشات کی اتباع کرنے والا ہے اور اس شخص سے بڑھ کر کون گمراہ ہوگا جس نے کسی منجانب اللہ دلیل کے بغیر اپنی خواہشات کی اتباع کی۔

عن ابن مسعود رض من احب ان یکرم دینه فلیعزل مخالطة الشیطان ومخالطة اصحاب الاهواء فان

ابن مسعودؓ سے مروی ہے جو شخص اپنے دین کو مکرم رکھنا چاہتا ہو، تو وہ شیطان اور اہل ہوی کی مخالطت سے احتراز کرے کیوں کہ

---

[1] الاعتصام ص ۱۹ ج ۳۰

[2] ابو داود احمد عن معاویہ رض بحوالہ مشکوٰۃ جلد ۱ ص ۳۱۔

مجالسهم الصق من الجرب [1]

ان کی ہم نشینی خارش سے بھی زیادہ آ لگنے والی ہے۔

ان رجلا سئل ابراهيم النخعي عن الاهوا ايها خير فقال ما جعل الله في شيء عن الهوىٰ مثقال ذرة من خير ما هي الا زينة الشيطان [2]

ابراہیم نخعیؒ سے ایک شخص نے "اھوا" کے بارے میں سوال کیا کہ ان میں کون بہتر ہے تو انھوں نے فرمایا کسی بھی "ھویٰ" میں اللہ تعالیٰ نے ذرہ بھر بھی خیر نہیں رکھی، یہ تو شیطان کی زینت ہے۔

قال الشعبي رح احذركم اهل هذه الاهواء المضلة [3]

شعبی رح نے فرمایا میں تم کو ان گمراہ کن خواہشات والوں سے بچنے کی تلقین کرتا ہوں۔

حضرت شاہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:

ومنها الاغراض الفاسدة الحاملة على التاويل الباطل كطلب مرضاة الملوك في اتباعهم الهوى لقوله تعالىٰ ان الذين يكتمون ما انزل الله من الكتاب ويشترون به ثمنا قليلا اولئك ما يأكلون في بطونهم الا النار [4]

فساد دین کے اسباب میں ایک سبب اغراضِ فاسدہ ہیں جن کی خاطر لوگ جھوٹی تاویلیں کرتے ہیں، جیسے بادشاہوں کی خوشنودی کی خاطر ان کی خواہش نفسانی پوری کرنے کیلئے لوگ ایسا کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں جو لوگ کتاب الٰہی کے احکام کو جو منزل من اللہ ہیں چھپاتے ہیں اور ان کے عوض کچھ قیمت لیتے ہیں وہ اپنے شکموں میں آگ بھرتے ہیں

---

[1] الاعتصام جلد ۲ صفحہ ۱۶۰،
[2] صفحہ ۲۶،
[3] منہاج السنہ جلد ۱ صفحہ ۱۴،
[4] حجۃ اللہ البالغہ ،، صفحہ ۲۸۲-۲۸۳۔

خلاصہ بحث

خلاصہ بحث یہ ہے کہ عدم تقلید کی وجہ سے جو افتراق واختلاف امت کے اندر پیدا ہوتا ہے وہ اسی تیسری نوع کا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث مذکور میں اسی کی خبر دی ہے اور اسی کی بنیاد پر امت مسلمہ مختلف گروہوں اور فرقوں میں تقسیم ہو جاتی ہے، اور اس اختلاف کے اسباب بھی عموماً یہی دو ہیں:

اتباع ہوی

عدم علم وصلاحیت کے باوجود علم واجتہاد کا ادعاء۔ اللّٰھم احفظنا منہ۔

انشاء اللہ آئندہ محاضرہ میں "تقلید کے ائمہ اربعہ میں انحصار" اور اسی ضمن میں دوسرے مباحث آئیں گے

شمس الاسلام

بابت سال ۱۴۱۵ھ

چوتھا محاضرہ علمیہ

بر موضوع

رد غیر مقلدیت

پیش کردہ

جناب مولانا محمد راشد ضیاء اعظمی

استاذ فقہ دار العلوم دیوبند

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مذاہبِ اربعہ کی تخصیص

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

تقلیدِ معین کے وجوب کے ثابت ہو جانے کے بعد یہ بات بھی پیشِ نظر رکھنی ضروری ہے کہ یہ تقلید ائمۂ اربعہ، پر منحصر ہے۔ یعنی انھیں حضرات ائمہ میں سے کسی ایک کی تقلید ضروری ہے۔ امت کے تمام قابلِ قدر اور اہم ترین علمائے کرام کا اس بات پر اجماع ہے کہ بعد کے ادوار میں بہت سے مصالح کی بنیاد پر ائمہ اربعہ کی تقلید سے خروج کرنا جائز نہیں رہا۔ یہ بات گزر چکی ہے کہ اجماعِ امت۔ اصولِ دین اور دلائلِ شریعت میں سے ہے۔ اس کی حجیت نصوص کتاب وسنت سے ثابت ہے۔ اس موقع پر نہایت تفصیل کے ساتھ علمائے کرام کے اقوال اور وہ وجوہات ومصالح بیان کی جاتی ہیں جو اس اجماع کی داعی اور متقاضی ہوئیں۔

حضرت مولانا وجیہ الدین صاحب مدرسِ اول مدرسہ کلکتہ نے اپنی محققانہ تصنیف "نظام الاسلام"[1] میں اس مسئلہ پر بڑی قیمتی بحث کی ہے۔ فرماتے ہیں۔

"اس زمانہ میں بلکہ زمانۂ دراز سے سب عالموں نے جب خوب دریافت کیا کہ قرآن اور حدیث سے بالاستقلال حکم نکالنا نہیں ہو سکتا ہے کیوں کہ ہر حدیث کو ثابت کرنا اور

---

[1] کتاب مذکور پہلی دفعہ ۱۲۷۲ھ میں شائع ہوئی یہ وہی دور ہے جبکہ مولوی عبدالحق صاحب بنارسیؒ وغیرہ نے تقلید کے خلاف شور وغوغا برپا کر رکھا تھا۔ یہ کتاب بہت مدلل اور مسئلہ تقلید پر مکمل تشفی بخش ہے اس زمانے کے تمام علمائے اہل سنت نے اس کو پسند کیا اور اسکی تصدیق کی۔ تنبیہ الضالین میں ہے "نظام الاسلام کے چھپ جانے سے بہت سے گمراہوں کو جن کو عقل تھی سوجھ آگئی اس بُرے اعتقاد سے انہوں نے توبہ کیا"، صـ

اس کے راویوں کا احوال دریافت کرنا اور صحیح اور حسن اور ضعیف اور غریب کی تحقیق کرنا اور مجمل اور مأوّل اور ناسخ اور منسوخ کو تمیز دینا اور ہر ایک کی غرض اور مراد کو پہنچنا بالاستقلال یعنی صرف اپنی تلاش اور جستجو سے حاصل نہ ہو سکے گا بلکہ آخر کو لاچار ہو کر پشیمان بن کر ان سب شرطوں کو حاصل کرنے کے لیے کسی محدّث یا مجتہد یا فقیہ کی تقلید کرنی پڑے گی تو ابتداء سے تقلید کسی مجتہد کی اپنے اوپر واجب کرنی ہے اور اسی واسطے سب علمانے اجماع کیا اس بات پر کہ جس مجتہد کے اجتہاد پر تمام علماء کا اتفاق ہوا اور سب فاضلوں کے نزدیک اس کا اجتہاد مقبول ہوا اور مذہب اس کا نقل تواتر سے منقول ہوا اور مسائل اور قواعد اس کے مذہب کے بشبہہ مفصلاً مروی ہوں تو ایسے کی تقلید درست ہے۔ پھر کوئی مجتہد ان اوصاف کے ساتھ سوائے چار امام کے پایا نہیں گیا اور کوئی مذہب ان صفات کے ساتھ سوا ان چار مذہب کے ثابت نہیں ہوا اس واسطے سب علماء اور تمامے فضلاء کا اجماع اس بات پر ہوا کہ ان چار مذہب میں سے ایک مذہب کی پیروی کرنی واجب ہے اور ان کے سوا کسی اور مجتہد کی تقلید یا دوسرے کسی طریقے کی پیروی جائز نہیں ہے اور کوئی یہ گمان نہ کرے کہ صرف علماء حنفی نے یہ اجماع کیا ہے، بلکہ دوسرے مذہب مختلف کے علماء نے بھی اسی بات پر اتفاق کیا ہے جیسا سابق جواب میں سوال چوبیسویں کے بہت سی کتابوں سے مذکور ہوا ہے پھر ثانیاً تفصیل کی حاجت نہیں ہے لیکن بطور نمونہ کے صرف ایک کتاب سے لکھا جاتا ہے۔ نہایۃ المراد شرح مقدمہ ابن عماد میں ہے۔

وفی زماننا قد ان عصرت صحة التقليد فی هذه المذاهب الاربعة فی الحكم المتفق عليه بينهم وفی الحكم المختلف فيه ايضًا لا باعتبار ان مذاهب غيرهم من السلف باطلة وانما لاعتبار ان مذاهبهم وصلت الينا بالنقل المتواتر رواها جماعة بعد جماعة فی كل ساعة من زمانهم الى

زماننا هٰذا لایمکن عدّ الروایة ولا احصائهم فی اقطار الارض وبنیت لنا شروط مذاهبهم وفصلت مجملاتها وقیدت مطلقاتها بالنقل المتواتر بخلاف مذاهب غیرهم من السلف فانها نقلت الینا بطریق الآحاد فلو فرض ان حکما من احکام نقل عن بعض مذاهب السلف بطریق التواتر یحتمل ان یکون مجملا لم یفصله ناقله وان له قیدا اخل به ناقله اوشرطًا یتوقف علی القول بصحته عند ذالك المجتهد فیکون العمل به باطلا فلهٰذا الامر حصرنا صحة التقلید فی اتباع المذاهب الاربعة لاغیر.

خلاصہ مضمون اس کا یہ ہے کہ اس زمانہ میں تقلید منحصر ہے انھیں چار کے ایک مذہب میں اوران چار کے سوا اور کسی مجتہد کی تقلید درست نہیں ہے اس واسطے کہ ان چار اماموں کا مذہب نقلِ متواتر سے منقول ہوا ہے اوران کے زمانہ سے لے کر اس زمانے تک اس قدر راوی ان مذہب کے گزرے ہیں کہ شمار کرنا ان کا ممکن نہیں ہے اوران مذہبوں کی شرطیں اور تفصیل خوب بیان کی گئی ہیں بخلاف اور مذہبوں کے کہ تواتر سے مروی نہیں ہے۔ اور تفصیل ان کی نہیں ہوئی ہے تو شاید کوئی کلام مجمل ہو کہ اس کی تفصیل نہیں ہوئی ہو یا کوئی قید چھوٹ گئی ہو یا کوئی شرط کہ جس پر صحت اس قول کی موقوف ہو متروک ہوئی ہو تو ان صورتوں میں عمل اس پر باطل ہوگا۔ اس واسطے انھیں چار مذہب میں تقلید منحصر ہوئی ہے۔

اور شافعی علماء نے بھی ایسے ہی کہا ہے جیسا کہ حافظ ابن حجر شافعیؒ نے فتح المبین فی شرح الاربعین کے اٹھائیسویں حدیث کی شرح میں لکھا ہے اما فی زماننا فقال ائمتنا لاتجوز تقلید غیر الائمة الاربعة الشافعی ومالك وابی حنیفة واحمد رضوان الله علیهم اجمعین۔ لان هٰؤلاء عرفت قواعد مذاهبهم واستقرت احکامها وخدمها تابعهم وحرروها تقریرًا وحکمًا

حکما فلا یوجد حکم الا وھو منصوص لھم اجمالا وتفصیلا بخلاف غیرھم فان مذاھبھم ان تحرروا لم تدون کذالک فلا تعرف لھا قواعد حتی تتخرج علیھا احکامھا فلم یجز تقلیدھم فی ما حفظ عنھم منھا لانہ قد یکون مشروطا بشروط اخری وکلوھا الی فروعھا من قواعدھم فقلت الثقۃ بجمیع ما یحفظ عنھم من قید وشرط فلم یجز التقلید حینئذ۔ خلاصہ ترجمہ یہ ہے کہ ہمارے اماموں نے یعنی شافعیوں نے کہا ہے کہ اس زمانے میں ان چار اماموں کے سوا اور کسی مجتہد کی تقلید جائز نہیں ہے۔ اس واسطے کہ ان چار اماموں کے مذہب اور ان کے قاعدے خوب معلوم و مشہور ہیں اور مسئلے ان کے خوب ثابت ہیں اور تابعیوں نے ان کے مذہب کو خوب ضبط کیا ہے اور بالتفصیل ہر ایک کو لکھا ہے بخلاف اور مجتہدوں کے کہ ان کا مذہب لکھا ہوا نہیں ہے اور قاعدہ ان کا معلوم نہیں اور تفصیل ان کے مذہب کی منقول نہیں اور مسائل ان کے مذہب کے ضبط نہیں اس واسطے دوسرے مذہب پر خوب اعتماد نہیں۔ اور مالکی علماء نے بھی ایسے ہی کہا ہے علامہ ابراہیم ابن مرعی سرخسی کہ مالکی المذہب اور فاضل اور محدث اور مالکیوں میں معتمد علیہ ہیں انھوں نے شرحت الوھبیہ فی شرح الاربعین للنووی۔ کی اٹھائیسویں حدیث کی شرح میں لکھا ہے ما عرف عن ھؤلاء الصحابۃ الاربعۃ او عن بعضھم او باتباع من بقیۃ الصحابۃ اذا وقع بینھم الخلاف الی قولہ وھذا انما المتلد الصرف فی تلک الازمنۃ القریبۃ من زمن الصحابۃ اما فیما بعد ذالک فلا یجوز تقلید غیر الائمۃ الاربعۃ مالک وابی حنیفۃ والشافعی واحمد لان ھؤلاء عرفت قواعد مذاھبھم واستقرت احکامھا وخدمھا تابعوھم وحرروھا قرعا وحکما مکما۔

خلاصہ اس کا یہ ہے کہ جو حکم شرع کا کہ ان چار خلیفوں سے یا بعض سے ان کی معلوم ہوا ہے تو وہ مقدم ہے دوسرے صحابی کے قول پر اور یہ بات اس زمانے کے مقلد کے حق میں تھی۔ لیکن اس زمانے کے بعد جائز نہیں ہے تقلید سوا ان چار اماموں کے یعنی مالک

ابو حنیفہ۔ شافعی۔ احمدؒ کیوں کہ ان کے مذہب کے قاعدے سب معروف ہیں اور مسائل ان کے خوب ثابت اور مشہور ہیں اور تابعوں نے ان کے خوب ضبط کیا ہے اور ہر ایک بات کو مفصلاً لکھا ہے۔ اب حاصل اس سب کا یہ ٹھہرا کہ شریعت کے علماء اور ہر مذہب کے فضلاء کا اجماع اور اتفاق اسی بات پر ہو گیا ہے کہ اس زمانے میں تقلید ایک امام کی ان چار اماموں میں سے واجب ہے اور ان کے سوا اور کسی کی تقلید درست نہیں ہے اور کسی عوام کو بلکہ اس زمانے کے خواص کو بھی اپنے سمجھ کے موافق قرآن و حدیث پر عمل کرنا اور اپنی دریافت پر اعتماد کر کے مسئلہ نکالنا جائز نہیں۔ اور اگر کوئی فاضل یا کوئی درویش اس اجماع سے نکلا ہو یا اس نے اس اتفاق کے برخلاف کیا ہو یا اس کے مخالف کہا ہو تو اس شخص کا کچھ اعتبار نہیں ہے کیونکہ وہ اجماع کی حدیثوں کے رو سے پیروی کرنی اس کی واجب ہے اور وہ اس سے عبارت ہے کہ اکثر علماء دین دار اور فضلاء نیک کردار ایک بات پر اتفاق کریں پھر اگر کوئی شخص اگرچہ عالم بھی ہو اس اجماع میں شریک نہ ہو تو اس کا کچھ اعتبار نہیں ہے۔ بلکہ وہ خود برخلاف ہوا اور جماعت کا مخالف بنا جیسا کہ مشکاۃ کے باب الاعتصام میں ہے۔ عن ابن عمر رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اتبعوا السواد الاعظم فانہ من شذ شذ فی النار[1] یعنی پیروی کرو جماعت کی سو مقرر یوں ہے کہ جو جدا ہوا جماعت سے گر پڑا وہ جہنم میں۔

وعن معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان الشیطان ذئب الانسان کذئب الغنم یأخذ الشاذۃ والقاصیۃ والناجیۃ وعلیکم بالجماعۃ والعامۃ[2]۔ یعنی بشبہہ شیطان آدمی کے حق میں جیسا کہ بھیڑیا بکری کے حق میں ہے کہ پکڑتا ہے بکری اور دور پڑے اور کنارے گرے ہوئے کو تو واجب تم پر ہے کہ جماعت اور اکثر مسلمانوں کی پیروی کرو لازم کرو۔

---

[1] مشکوٰۃ شریف باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ ص ۳۰

[2] مشکوٰۃ شریف ص ۳۱۔

وعن ابی ذرؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من فارق الجماعۃ شبرا فقد خلع ربقۃ الاسلام عن عنقہ۔[1]

یعنی جو کوئی جدا ہوا جماعت سے ایک بالشت کے اندازے تو بتحقیق اس نے اسلام کا ڈورا اپنی گردن سے نکالا۔ غرض ان حدیثوں سے صاف ظاہر ہوا کہ اکثر مسلمان جس بات پر اتفاق کریں وہ واجب ہوتا ہے اور بعضے کا خلاف کرنا کچھ نہیں ہے بلکہ جو اکثر کا مخالف ہوا تو اس پر خوف ضلالت کا اور ڈر جہنم کا ہے۔ نعوذ باللہ منہا ومنہم اور جو کوئی جماعت کی پیروی کرے گا تو وہ ہدایت پر رہے گا اور ضلالت سے بچے گا۔[2]

اس مفصل عبارت سے بطور اختصار یہ چند باتیں ثابت ہوئیں۔

۱:۔ یہ اجماع ہے کہ سارے علماء و فضلاء کے نزدیک جس مجتہد کا مذہب مقبول ہو، جس کے اصول و قواعد مفصل ہوں اور جو تواتر سے منقول ہو۔ اسی کی تقلید جائز ہے

۲:۔ یہ بات صرف ائمہ اربعہ ہی کو حاصل ہے۔

۳:۔ تمام علماء فضلاء کا اجماع ہے کہ ان چار مذہبوں میں سے کسی ایک کی پیروی کرنی واجب ہے۔

۴:۔ صرف علماء احناف ہی نہیں بلکہ تمام مسالک کے علماء کا اس پر اجماع ہے۔

۵:۔ اگر کوئی شخص اس اجماع میں شریک نہ ہو تو اس کا کچھ اعتبار نہیں بلکہ وہ اجماع کا مخالف قرار دیا جائے گا۔ حضرات علماء حرمین شریفین نے بھی اپنے فتویٰ[3] میں انہیں حقائق کا اظہار کیا ہے فرماتے ہیں:

---

[1] مشکوٰۃ شریف ص ۳۱

[2] نظام الاسلام ص ۱۰۹ تا ۱۱۳

[3] مذکورہ فتویٰ کی نسبت تنبیہ الضالین میں لکھا ہے کہ:

"آخر اس مذہب نو کی کیفیت علمائے حرمین شریفین کی خدمت میں ظاہر کی انہوں نے ان کے طریقے کو مردود اور جھوٹے ہونے کا فتویٰ دیا"، ص ۴۔

"والحاصل انه لاینبغی لعاقل ان یختار فی الدین طریقة الا ما ارتضاها السلف والخلف وتواترت روایته وحصل الاجماع فی کل عصر علی حقیة ذالك فلم یوجد متصف کذالك الا ما اجمع علیه العلماء من حقیة المذاهب الاربعة عصرا بعد عصر وتلقتهم الامة بالقبول واما ما لم یُنقل متواترا ولم یجمع علی حقیة ولم تلقته الامة کلها بالقبول فلا یلتفت الیه ولا یعول علیه[1]۔

حاصل یہ ہے کہ کسی عاقل کے لیے یہ مناسب نہیں کہ دین میں کوئی طریقہ اختیار کرے بجز اس طریقہ کے جس کو علماء سلف اور خلف نے پسند کیا ہو جس کی روایت تواتر سے ہو جس کی حقیت پر ہر دور میں اجماع رہا ہو۔ اور ایسا کوئی مذہب نہیں پایا گیا مگر یہی چار مذہب کہ سب علماء نے ان کی حقیت پر اجماع کیا اور تمام امت نے ان کو تلقی بالقبول سے نوازا۔ اور جو مذہب کے تواتر سے منقول نہیں اور علماء نے اس کی حقیت پر اجماع نہیں کیا اور سب مسلمانوں نے اس کو قبول نہیں کیا تو اس کی طرف التفات اور اس پر اعتماد نہیں کیا جائے گا۔

علماء حرمین کا یہ فتویٰ اہم ہے کیوں کہ خود علمائے حرمین کی اہمیت ہر دور میں اسلام کے اندر مسلم رہی ہے۔ بخاری شریف میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ باب قائم فرماتے ہیں۔

بَابُ ماذکر النبی صلی اللہ علیہ وسلم وحض علی اتفاق اھل العلم وما اجمع علیه الحرمان مکة والمدینة[2]۔

اس چیز کا باب کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ذکر کیا اور اہلِ علم کے اتفاق پر تلقین فرمائی اور علمائے حرمین کے اجماع کا باب۔

امام بخاریؒ کا یہ باب قائم کرنا اجماع اہل حرمین کی عظمت اور اہمیت کی بنیاد پر ہے۔ خود امام بخاری رح اور بعض علماء کے نزدیک اجماع اہل حرمین حجت ہے

---

[1] نظام الاسلام ص ۵۱۔۵۲ [2] بخاری شریف ج ۳ ص ۱۰۸۹ نیز ملاحظہ ہو فتح القدیر ص ۱۲۱

تقلید ائمہ کے منکر حضرات بھی علامہ ابن تیمیہؒ کے پایۂ علم و تحقیق کے حدود رجہ معترف ہیں۔
علامہ موصوف کا ارشاد ہے:

ولیس فی الکتاب والسنۃ فرق فی الائمۃ المجتہدین بین شخص وشخص، فمالک واللیث بن سعد والاوزاعی والثوری ھؤلاء ائمۃ فی زمانھم، وتقلید کل منھم کتقلید الآخر لا یقول مسلم انہ یجوز تقلید ھذا دون ھذا، ولکن من منع من تقلید احد ھؤلاء فی زماننا فانما یمنعہ لاحد شیئین (احدھما) اعتقادہ انہ لم یبق من یعرف مذاھبھم وتقلید المیت خلاف مشھور فمن منعہ قال ھؤلاء موتی. ومن سوغہ قال لابد ان یکون فی الاحیاء من یعرف قول المیت (والثانی) ان یقول الاجماع الیوم قد انعقد علی خلاف ھذا القول..... واما اذا کان القول الذی یقول بہ ھؤلاء الائمۃ وغیرھم قد قال بہ بعض العلماء الباقیۃ مذاھبھم فلا ریب ان قولہ

کتاب وسنت کے اعتبار سے ائمہ مجتہدین کے درمیان کوئی فرق نہیں، پس امام مالک اور لیس ابن سعدؒ، امام اوزاعیؒ، اور سفیان ثوریؒ یہ سب حضرات اپنے اپنے زمانوں کے امام ہیں، اور ان میں سے ہر ایک کی تقلید کا حکم وہی ہے جو دوسرے کی تقلید کا ہے، کوئی مسلمان یہ نہیں کہتا کہ اس کی تقلید تو جائز ہے اور اس کی جائز نہیں۔ لیکن جن حضرات نے ان میں سے کسی کی تقلید سے منع کیا ہے دو باتوں میں سے کسی بات کی بنا پر منع کیا ہے: ایک بات تو یہ ہے کہ ان کے خیال میں اب ایسے لوگ باقی نہیں رہے جو ان حضرات کے مذاہب کی پوری طرح واقف ہوں، اور فوت شدہ امام کی تقلید میں اختلاف مشہور ہی ہے، لہٰذا جو لوگ اسے منع کرتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ ان حضرات کا انتقال ہوچکا اور جو حضرات فوت شدہ امام کی تقلید کو جائز مانتے ہیں، ان کا کہنا یہ ہے کہ فوت شدہ امام کی تقلید اس وقت جائز ہے جبکہ زندہ علماء میں کوئی اس فوت شدہ امام کے مذہب کا علم رکھتا ہو، (اور چونکہ دوسرے ائمہ کے

من یدعی موافقتھم ولیعتمد فیہ۔

مذاہب کا علم رکھنے والا موجود نہیں، اس لیے ان کی تقلید بھی درست نہیں)

⁂ ⁂ ⁂

دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ حضرات یہ کہتے ہیں کہ (جن حضرات کے مذاہب باقی نہیں انکے) قول کے خلاف اجماع منعقد ہو چکا ہے۔

⁂ ⁂ ⁂

لیکن اگر ان گزشتہ ائمہ کا کوئی قول ایسا ہو جو ان مجتہدین کے قول کے مطابق ہو جن کے مذاہب باقی ہیں تو بلاشبہ اول الذکر ائمہ کے قول کی ثانی الذکر علماء کے قول سے تائید ہو جائے گی، اور اس میں قوت آجائے گی

⁂ ⁂ ⁂

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مشہور کتاب "عقد الجید" میں اس موضوع پر ایک مستقل باب قائم فرمایا ہے۔ جس کا عنوان ہے "باب تاکید الاخذ بھذہ المذاہب الاربعۃ والتشدید فی ترکہا والخروج عنہا"

باب ۱۵ میں ان چاروں مذہبوں کے اختیار کرنے کی تاکید اور ان کو چھوڑنے اور ان سے باہر نکلنے کی شدید ممانعت میں۔

اس باب میں شاہ صاحبؒ نے بڑی تفصیل کے ساتھ مختلف وجوہ سے یہ ثابت کیا ہے کہ تمام مفاسد کا سدباب اور مکمل حزم و احتیاط اسی میں ہے کہ ان ائمہ میں سے کسی ایک کی تقلید کی جائے فرماتے ہیں:

"اعلم ان فی الاخذ بھذہ المذاہب الاربعۃ مصلحۃ عظیمۃ وفی الاعراض عنہا کلہا او بعضہا مفسدۃ کبیرۃ ونحن نبین ذالک بوجوہ، احدہا ان الامۃ

جاننا چاہیے کہ ان چاروں مذہبوں مذہبوں کے اختیار کرنے میں ایک بڑی مصلحت ہے اور ان سب کے سب سے روگردانی میں بڑا فساد ہے اور ہم اس بات کو کئی وجہوں سے بیان کرتے ہیں، وجہ اول یہ ہے کہ امت کے

لہ الفتاوی الکبری لابن تیمیہ ص ۲۴۲ ج ۲

اجمعت علی ان یعتمدوا علی السلف فی معرفۃ الشریعۃ، فالتابعون اعتمدوا فی ذالک علی الصحابۃ وتبع التابعین اعتمدوا علی التابعین وھکذا فی کل طبقۃ اعتمد العلماء علی من قبلھم والعقل یدل علی حسن ذالک لان الشریعۃ لایعرف الا بالنقل والاستنباط، والنقل لایستقیم الا بان یاخذ کل طبقۃ عمن قبلھا بالاتصال ولابد فی الاستنباط ان یعرف مذاھب المتقدمین، لئلا یخرج من اقوالھم فیخرق الاجماع ویبنی علیھا ویستعین فی ذالک بمن سبقہ، لان جمیع الصناعات کالصرف والنحو والطب والشعر، والحدادۃ والنجارۃ والصیاغۃ لم یتیسر لاحد الا بملازمۃ اھلھا وغیر ذالک نادر بعید لم یقع وان کان جائزاً فی العقل واذا تعین الاعتماد علی اقاویل

اس بات پر اجماع کیا ہے کہ شریعت کے معلوم کرنے میں سلف پر اعتماد کریں مثلاً تابعین نے اس بارے میں صحابہ پر اور تبع تابعین نے تابعین پر اعتماد کیا، اور اسی طرح ہر طبقہ میں علماء نے اپنے پہلے علماء پر اعتماد کیا، اور اس امر کی خوبی پر عقل بھی دلالت کرتی ہے، کیونکہ شریعت دو ہی باتوں سے معلوم ہوتی ہے ایک نقل دوم استنباط، اور نقل اسیطرح سے ٹھیک ہوتی ہے کہ ہر طبقہ اپنے پہلے طبقہ سے بیہم لیتا چلا آئے، اور استنباط میں ضروری ہے کہ مذہب پہلوں کے جانے اس وجہ سے کہ ان کے اقوال سے باہر نہ ہو جائے ورنہ اجماع کے خلاف ٹھہرے گا، اور اس وجہ سے کہ پہلوں کے مذاہب پر اپنا قول مبنی کرے اور اس وجہ سے کہ استنباط میں اپنے گزشتوں سے اعانت لے کیوں کہ سب فنون، مثل صرف اور نحو اور طب اور شعر اور آہنگری اور بڑھئی گری اور زرگری کے کسی کو جب ہی میسر ہوتے ہیں کہ اس فن کے ماہر کی خدمت گزاری کرے، اور دوسری طرح آجانا کم اور بعید از قیاس ہے۔ کہ کبھی ہوا نہیں اگرچہ عقل کے نزدیک اور طرح بھی ممکن ہے اور جب اقوالِ سلف پر اعتماد کرنا

السلف فلا بد من ان یکون
اقوالهم التی یعتمد علیها
مرویة بالاسناد الصحیح
او مدونة فی کتب مشهورة
وان یکون مخدومة بان یبین
الراجح من محتملاتها وتخصص
عمومها فی بعض المواضع وتقید
مطلقها فی بعض المواضع ویجمع
المختلف فیها ویبین علل
احکامها والا لم یصح الاعتماد
علیها ولیس مذهب فی هذه
الازمنة المتاخرة بهذه الصفة
الا هذه المذاهب الاربعة
واما المذهب الامامیة
والزیدیة وهم اهل البدعة
فلیس الاعتماد علی اقاویلهم

ثابت ہوا تو اب یہ ضروری ہے کہ ان کے
وہ اقوال جن پر اعتماد کیا جائے یا سند صحیح
سے روایت کیے گئے ہوں یا مشہور
کتابوں میں قلم بند ہوں۔ اور یہ بھی ضروری
ہے کہ ان اقوال پر بحث ہوئی ہو۔ ان میں سے
احتمال راجح کا بیان کر دیا جائے، اور عام
اقوال بعض مواضع میں مخصوص کیے جائیں
اور اقوالِ مطلق کو بعض موقعوں میں مقید کیا
جائے۔ اور جن اقوال میں اختلاف ہو۔
ان میں مطابقت کی جائے اور ان کے
احکام کی علتیں بیان کی جائیں۔ اور اگر یہ
باتیں ان اقوال میں مشرح نہ ہوں گی تو اُن پر
اعتماد درست نہ ہوگا، اور ان اخیر وقتوں میں
کوئی مذہب اس صفت کا سوائے ان چاروں
مذہبوں کے نہیں، مگر ہاں امامیہ اور زیدیہ
کا مذہب ہے اور وہ فرقہ بدعت والے ہیں ان کے
اقوال پر اعتماد کرنا درست نہیں۔

ثانیا، قال رسول الله صلی الله
علیه وسلم اتبعوا السواد الاعظم
ولما اندرست المذاهب الحقة
الا هذه الاربعة کان اتباعها
اتباعا للسواد الاعظم والخروج

اور دوسری وجہ پابندی مذہب کی یہ ہے کہ
رسولِ خدا نے فرمایا کہ پیروی کرو بڑے جتھے
کی اور چونکہ سچے مذہب سوائے ان چاروں
مذہبوں کے نیست ہو گئے تو انکی پیروی کرنے میں
بڑے انبوہ کی پیروی کرنی ہے اور ان سے

عنها خروجًا عن السواد الاعظم
وقع لشها، ان الزمان لما طال
وبعد العهد وضيعت الأمانة
لم يجز ان يعتمد على اقوال علماء
السوء من القضاة الجورة
والمفتين التابعين لاهوائهم حتى
ينسبوا ما يقولون الى بعض من
اشتهر من السلف بالصدق
والديانة والامانة اما صريحًا
او دلالة وحفظ قوله ذالك
ولا على قول من لا ندري هل
جمع شروط الاجتهاد او لا فانه
راينا العلماء مجتهدين في حفظ
مذاهب السلف حتى ان يصدقوا
في تخريجاتهم على اقوالهم
واستنباطهم من الكتاب والسنة
واما اذا لم نرى منهم ذالك فهيهات[1]

باہر نکلنا پڑے جتھے سے باہر ہونا ہے۔
اور تیسری وجہ پابندی مذہب کی یہ ہے
جب عمدہ زمانہ کو گزرے بہت دن ہو گئے اور
اور عرصہ بعید پڑ گیا اور امانتیں تلف کر دی
گئیں تو اب اعتماد نہیں ہو سکتا علماء پر یعنے
ظالم قاضیوں اور ہوا پرست مفتیوں کے
اقوال پر جن کی شرارت یہاں تک ہے اپنے
قول کو سلف کے ایسے شخص کی طرف
بصراحت یا بدلالت منسوب کرتے ہیں جو صدق اور دیانت
اور امانت میں مشہور اور اس کا قول زبانوں پر
مذکور ہوا ور نہ اس شخص کے قول پر اعتماد
ہو سکتا ہے کہ ہم نہیں جانتے کہ آیا شرطیں
اجتہاد کی رکھتا ہے یا نہیں۔ پس جب ہم
علماء کو دیکھیں کہ سلف کے مذاہب میں نہایت
قدم ہیں تو غالب ہے کہ وہ مسائل جو علماء
سلف کے اقوال کے بموجب نکالیں یا خود
کتاب وسنت سے استنباط کریں، اس میں
علماءِ مذکور راست جانے جائیں گے اور جب
ہم علماء میں یہ بات نہ دیکھیں تو ان کے
اقوال کو راست جاننا بعید ہے۔

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ان بلند پایہ تحقیقات کا حاصل یہ ہے کہ:
(۱) شریعت پر چلنے کے لیے اسلاف پر اعتماد ضروری ہے کیوں کہ شریعت حق کا دار و مدار

---

[1] عقد الجید ص ۳۱ - ۳۲ - ۳۳۰

نقل پر ہے۔ متقدمین سے ثابت شدہ قول کے خلاف کسی رائے پر عمل کرنا خلاف اجماع ہے اسلاف کرام پر اعتماد کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کے اقوال یا تو سندِ صحیح کے ساتھ مروی ہوں یا کتبِ مشہورہ میں مدوّن ہوں۔ نیز ان کے اقوال پر ضروری کام ہو چکا ہو۔ یعنی ان کے اقوال میں مختلف معانی کے محتمل قول کے راجح پہلو کی وضاحت، نیز وہ قول بظاہر عام یا مطلق ہو لیکن درحقیقت اس میں کوئی تخصیص یا قید ملحوظ ہو تو اس کی تحقیق ان کے متضاد اقوال کے درمیان تطبیق احکام کی علتوں کی تبیین۔ اس طرح کی ضروری چیزوں پر اس مذہب کے مزاج شناس علماء نے اچھی طرح کام کر دیا ہو۔ یہ تمام صفات ائمہ اربعہ کے علاوہ کسی بھی مجتہد کے مذہب میں نہیں پائی جاتیں۔

(۲) حضورؐ کا ارشادِ مبارک ہے "اتبعوا السواد الاعظم"۔ مذہبِ اربعہ کے علاوہ کوئی بھی مذہب قابلِ عمل شکل میں باقی نہیں رہ گیا تو اب سوادِ اعظم انہیں مذاہب اربعہ میں منحصر ہو گیا۔

(۳) خواہش کے پیرو علمائے سو اپنی خواہش کے مطابق کوئی رائے ایجاد کر کے علمائے محققین میں سے کسی کی طرف منسوب کر دیں گے۔ اس فتنے کا سدِّ باب یہی ہے کہ صرف انہیں علماء کے قول پر فتویٰ کی اجازت دی جائے جن کے اقوال کی توضیح و تشریح کی ضروری خدمت کی جا چکی ہے تاکہ ان کی طرف کسی غلط بات کے انتساب کا خدشہ نہ رہ جائے۔ اور یہ ضروری خدمت صرف مذاہب اربعہ کی ہو سکی ہے۔

بے شمار علمائے کرام نے اپنی تصانیف میں اس موضوع پر روشنی ڈالی ہے اس موقع پر ہم مزید چند اہم اور قابلِ قدر علمائے امت کی تصریحات پیش کرتے ہیں۔ تاکہ مسئلہ ہر گوشہ مختلف انداز میں نکھر کر سامنے آسکے۔

علامہ سید السمہودی الشافعیؒ العقد الفرید میں فرماتے ہیں:

نقل امام الحرمین عن المحققین امتناع تقلید العوام للصحابة رضوان الله علیهم اجمعین وان کانوا اجل قدرًا لارتفاع

ترجمہ: امام الحرمین نے محققین سے نقل کیا ہے کہ عوام کو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی تقلید جائز نہیں اگرچہ ان کا رتبہ بہت بڑا ہے۔ کیوں کہ ان کے مذہب

الثقة بمذاهبهم اذ لم تدوّن ولم تحرّر بخلاف مذاهب الائمة الذين لهم اتباعٌ وهٰذا احد قولين حكاهما ابن السبكي في جمع الجوامع من غير ترجيح وبه جزم ابن الصلاح وزاد انه لا يقلد التابعين ايضًا ولا غيرهم ممن لم يدون مذهبه وان التقليد متعين للائمة الاربعة دون غيرهم لان مذاهبهم انتشرت حتى ظهر تقييد مطلقها وتخصيص عامها بخلاف غيرهم ففيه فتاوىً مجردة لعل لها مكملا او مقيدا والوانبسط كلامه فيها لظهر خلاف مايبدو منه فامتناع التقليد اذا لتعذر الوقوف على حقيقة مذاهبهم، والثاني جواز تقليدهم كسائر المجتهدين قال ابن السبكي وهو الصحيح عندي غير اني اقول لا خلاف في الحقيقة بل ان تحقق مذهب لهم جاز وفاقًا والا فلا قلت وان تحقق ذالك فلم يتفرع على ايجاب

مدوّن اور مرتب نہیں ہو سکے اس لیے ان پر اعتماد نہیں رہ گیا۔ بخلاف ائمہ اربعہ جن کے متبعین بے شمار ہیں۔ یہ ان دو قولوں میں سے ایک ہے جس کو علامہ ابن سبکیؒ نے جمع الجوامع میں بلا کسی ترجیح کے نقل کیا ہے اور ابن صلاحؒ نے اس کو قطعی قرار دیا ہے اور یہ مزید لکھا ہے کہ تابعین وغیرہ کی بھی تقلید جائز نہیں جن کے مذاہب مدوّن نہیں ہو سکے اور بے شک تقلید صرف ائمہ اربعہ کی متعین ہے کیونکہ انہیں حضرات کے مذاہب پھیلے اور انہیں کے مطلق کی تقیید اور عام کی تخصیص کی گئی۔ بخلاف دوسرے حضرات کے کہ ان صرف فتاوے ہیں جنہیں احتمال ہے کہ مکملات و مقیدات ہوں۔ اگر فتاویٰ میں ان کے کلام کی تفصیل کیجائے تو ممکن ہے کہ ظاہر عبارت کے خلاف صورتحال ہو تو ان کے تقلید کا ناجائز ہونا محض انکے مذاہب کی اصل حقیقت کی واقفیت محال ہونے کی بنا پر ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ صحابۂ کرام کی تقلید جائز ہے جیسا کہ دوسرے مجتہدین کی تقلید جائز ہے۔ ابن سبکیؒ نے اسی کو صحیح قرار دیا ہے مگر وہ فرماتے ہیں کہ ان مذاہب کے حق ہونے میں کوئی اختلاف

المتمذهب بمذهب معين في جميع المسائل ومنع الانتقال عنه اخلا يعم مذهب الصحابي كل المسائل، وقال محقق الحنفيه الكمال ابن الهمام رحمه الله تعالى نقل الامام ابي الفخر الرازيؒ اجماع المحققين على منع العوام من تقليد اعيان الصحابة بل يقلدون من بعدهم الذين سبروا ودونوا وعلى هذا ذكر بعض المتاخرين من منع تقليد غير الاربعة لانضباط مذاهبهم. وتقيد مسائلهم وتخصيص عمومها ولم يقدر عليه في غيرهم لانقراض اتباعهم وهو صحيح[1]

نہیں ہے۔ بلکہ صحابہ کرام رضؓ میں سے کسی کے مذہب کی تحقیق ہو جائے تو اس کی تقلید بالاتفاق جائز ہے ورنہ نہیں۔ میں کہتا ہوں اگر مذہب صحابی کی تحقیق ہو جائے تو تقلید کا عدم جواز تمام مسائل میں مذہب معین کی تقلید کے ضروری ہونے اور اس سے انتقال کے ناجائز ہونے کی وجہ سے ہوگا کیوں کہ ایک صحابی کا مذہب تمام مسائل کو محیط نہیں ہو سکتا۔ احناف کے محقق الکمال ابن الہمام رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ امام رازیؒ نے تحریر فرمایا ہے کہ محققین کا اجماع ہے کہ عوام کے لیے صحابہ کرام رضؓ کی تقلید جائز نہیں بلکہ بعد کے ان لوگوں کی تقلید کریں جن لوگوں نے تحقیق و تدوین کی اور مسائل کو ان کے ابواب میں رکھا۔ اسی بنا پر بعض متاخرین نے ائمہ اربعہ کے علاوہ کی تقلید کا عدم جواز نقل کیا کیونکہ ان کے مذاہب منضبط ہیں۔ ان کے مسائل کی تقیید اور عمومات کی تخصیص ہو چکی اور یہ بات دوسرے حضرات کے سلسلہ میں نہیں کیوں کہ ان کے متبعین ہی نہیں رہ گئے یہی بات صحیح ہے۔

---

[1] العقد الفريد بحواله انتصار الحق ص ۹۱-۹۲۔

اسی بات کو علامہ نوویؒ ان الفاظ میں واضح فرماتے ہیں:

ولیس لہ التمذھب بمذھب احد من ائمۃ الصحابۃ رضی اللہ عنھم وغیرھم من الاوّلین وان کانوا اعلم واعلیٰ درجۃ ممن بعدھم، لانّھم لم یتفرّغوا لتدوین العلم وضبط اصولہ وفروعہ فلیس لاحد منھم مذھب مھذب محرّر مقرر وانما قام بذلک من جاء بعدھم من الائمۃ الناظرین لمذاھب الصحابۃ والتابعین القائمین بتمھید احکام الوقائع قبل وقوعھا الناھضین۔ بایضاح اصولھا وفروعھا کمالک وابی حنیفۃ۔

صحابۂ کرامؓ اور قرونِ اولیٰ کے اکابر اگرچہ درجہ کے اعتبار سے بعد کے فقہاء مجتہدین سے بلند و برتر ہیں، لیکن انہیں اتنا موقع نہیں ملا کہ وہ اپنے علم اور اس کے اصول و فروع کو مدوّن اور منضبط کر سکتے، اس لیے کسی شخص کے لیے ان کے فقہی مذہب کی تقلید جائز نہیں، کیونکہ ان میں سے کسی کا مذہب مدوّن نہیں ہو سکا، نہ وہ لکھی ہوئی شکل میں موجود ہے اور نہ معین طور سے اس کی نشاندہی کی جا سکتی ہے، دراصل تدوینِ فقہ کا یہ کام بعد کے ائمہ نے کیا ہے، جو خود صحابہؓ و تابعین کے مذاہب کے خوشہ چیں تھے اور جنھوں نے واقعات کے پیش آنے سے پہلے ہی ان کے احکام مدوّن کیے اور اپنے مذاہب کے اصول و فروع کو واضح کیا مثلاً امام مالکؒ اور امام ابوحنیفہؒ۔

علامہ نوویؒ اور علامہ سمہودیؒ کے کلام کا حاصل یہ ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی تمام تر عظمتوں اور رفعتوں کے باوجود ان کی تقلید کرنے کا راز یہ ہے کہ ان حضرات کو اپنے مذاہب کی تدوین و تہذیب کے مواقع نہ مل سکے اور نہ ان کے بعد والے ان کے سلسلہ میں یہ کام کر سکے۔ اور اگر ان حضرات کے اقوال ملتے بھی ہیں تو ان میں سے کسی ایک کے بھی اتنے اقوال نہیں ملتے جو تمام یا اکثر مسائل کو حاوی ہوں اس لیے ان میں سے کسی کی بھی مکمل تقلید ممکن نہیں لامحالہ بہت سے مسائل میں دوسروں کی طرف رجوع کرنا ہوگا اور

یہ ایک مذہب سے دوسرے مذہب کی طرف منتقل ہونا ہے جو جائز نہیں رہا۔ اس کے برخلاف ائمہ اربعہ کے اصول و فروع منضبط اور محفوظ ہیں جن سے پیش آمدہ تمام مسائل میں رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ اور پھر ان حضرات نے صحابہ کرامؓ کے تمام اقوال کو اپنے مذاہب میں سمیٹ بھی لیا ہے۔

بحر العلوم مولانا عبد العلی فرنگی محلیؒ شرح مسلم الثبوت میں فرماتے ہیں:

بل یجب علیهم اتباع الذین سبروا ای تفحصوا وبوبوا ای اوردوا ابوابا لکل مسئلة علی حدة فهذبوا مسئلة کل باب وتتبعوا کل مسئلة عن غیرها وجمعوا بینهما بجامع وفرقوا بفارق وعللوا ای اوردوا لکل مسئلة علتها وفصلوا تفصیلا وعلیه بنا ابن الصلاح منع التقلید غیر الائمة الاربعة الامام المهمام امامنا الائمة امامنا الکوفی والامام مالک والامام الشافعی والامام احمد رحمهم الله تعالی وجزاهم عنا احسن الجزاء لان ذالک المذکور لم یدر فی غیرهم[1]

ترجمہ: بلکہ ان عوام پر ان حضرات کی تقلید واجب ہے جنہوں نے نظر عمیق سے کام لیا اور ابواب قائم کرکے ہر مسئلہ کو اس کے مناسب باب میں ذکر کیا اور ہر مسئلہ کی تنقیح اور چھان بین کی اور جمع کیا اور تفریق کی اور ہر مسئلہ کی علت بیان کی اور پوری پوری تفصیل بیان کی اسی بنا پر ابن صلاحؒ نے ائمہ اربعہؒ کے سوا دوسروں کی تقلید سے ممانعت فرمائی ہے کہ امور مذکورہ مذاہب اربعہ کے علاوہ کسی اور مذہب میں موجود نہیں ہیں اللہ تعالیٰ ان ائمہ کو ہم سب کی طرف سے بہترین جزا عنایت فرمائے۔

علامہ شیخ احمد المعروف بہ ملا جیون صاحبؒ تفسیرات احمدیہ میں فرماتے ہیں:

---

[1] فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت ۲۲۹۔

قد وقع الاجماع علیٰ ان الاتباع انما یجوز للاربع وکذا لا یجوز الاتباع لمن حدث مجتهدٌ امخالفا لهم[1]

اس پر اجماع ہوگیا ہے کہ اتباع صرف ائمۂ اربع ہی کی جائز ہے ... ان حضرات کے بعد میں پیدا ہونے والے ان کے مسلک کے مخالف مجتہد کی تقلید درست نہیں۔

چند سطور کے بعد مسئلۂ مذکورہ کی مزید توضیح و تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

والانصاف ان انحصار المذاهب فی الاربعة واتباعهم فضلٌ الٰهیٌ وقبولیة من عند الله لامحال فیه للتوجیهات والادلة[2]

یعنی انصاف کی بات یہ ہے کہ مذاہب کا چار میں منحصر ہوجانا اور ان ہی چار مذاہب کی اتباع کرنا فضلِ الٰہی اور منجانب اللہ قبولیت ہے اس میں دلائل اور توجیہات کی حاجت نہیں ہے۔

⁂

حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ جنھیں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رح "بیہقی وقت" کے لقب سے یاد کرتے تھے اپنی مایۂ ناز تفسیر "تفسیر مظہری" کے اندر فرماتے ہیں کہ ائمہ اربعہ کی تقلید پر اہلِ سنت والجماعت کا انحصار ہوگیا ہے۔ قرنِ ثالث یا رابع کے بعد ان کی مخالفت کے بطلان پر اجماع مرکب منعقد ہوچکا ہے۔

قاضی صاحب کے الفاظ ہیں:

فان اهل السنة والجماعة قد افترق بعد القرن الثالثة او الرابعة علی اربعة المذاهب ولم یبق فی خروج المسائل سوی هذه المذاهب الاربعة فقد انعقد الاجماع المرکب علی بطلان

تیسری یا چوتھی صدی کے بعد اہل سنت والجماعت کے چار مذاہب رہ گئے ہیں مسائلِ فرعیہ میں ان کے سوا کوئی اور مذہب باقی نہیں رہا تو اجماع مرکب منعقد ہوگیا کہ جو قول ان چاروں میں ہر ایک کے مخالف ہو وہ باطل ہے۔

---

[1] تفسیرات احمدیہ ص ۳۴۶ [2] ایضاً ۳۴۶۔

قول من یخالفہ کلھم وقد قال اللہ تعالیٰ ومن یتبع غیر سبیل المومنین نولہ ما تولّٰی ونصلہ جھنم وساءت مصیراً

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔ جو شخص مومنین کا راستہ چھوڑ کر دوسرے راستہ کو اختیار کرے گا تو ہم اس کو جو کچھ وہ کرتا ہے کرنے دیں گے اور اس کو جہنم میں داخل کریں گے اور وہ بُرا ٹھکانہ ہے۔

شیخ عبدالحق محدّث دہلویؒ شرح سفر السعادت میں تحریر فرماتے ہیں:

خانہ دین چہار است ہر کہ راہ از ہیں راہ ہائی دورے از ہیں درہائے اختیار نمودہ براہے دیگر رفتن ودرے دیگر رفتن عبث وباوہ شاوکارخانۂ عمل را از ضبط ورابط بیروں افگندن واز راہ مصلحت بیروں افتادن است[2]

یعنی دین کے گھر چار ہیں جس شخص نے کوئی راہ ان راہوں میں سے اور کوئی دروازہ ان دروازوں میں سے اختیار کیا۔ تو اس کا دوسری راہ اور دوسرا دروازہ اختیار کرنا بیہودہ اور عبث ہے اور کارخانۂ عمل کو مضبوطی اور استقامت سے دور کرنا ہے اور مصلحت سے باہر جانا ہے۔

سید احمد طحطاویؒ فرماتے ہیں،

فعلیکم یا معشر المومنین باتباع الفرقۃ الناجیۃ المسماۃ باھل السنۃ والجماعۃ فانّ نصرۃ اللہ فی موافقتھم وخذلانہ وسخطہ ومقتہ فی مخالفتھم وھذہ الطائفۃ الناجیۃ قد اجتمعت الیوم

یعنی اے گروہ مسلمانان! تم پر نجات پانے والے فرقہ کی جو اہلِ سنت والجماعت کے نام سے موسوم ہے پیروی کرنا واجب ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی مدد اہلِ سنت والجماعت کے ساتھ موافقت کرنے میں ہے اور اہلِ سنت والجماعت کی مخالفت کرنے میں اپنی ذات کو خدا تعالیٰ کے غضب

---

[1] تفسیر مظہری ص ۶۴ ج ۳ [2] شرح سفر السعادت ص ۲۱۔

فی المذاهب الاربعة هم الحنفيون والمالكيون والشافعيون والحنبليون ومن كان خارجًا من هذه الاربعة فی ذالك الزمان فهو اهل البدعة والنار[1]

اور ناراضگی کا مورد بنا ناہے (اللہ اپنی پناہ میں رکھے) اور یہ نجات پانے والا گروہ (یعنی اہل سنت والجماعت) آج مجتمع ہوگیا ہے۔ چار مذاہب ہیں۔ اور وہ حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی ہیں اور جو شخص اس زمانہ میں چار مذاہب سے خارج ہے وہ اہلِ بدعت اور اہلِ نار سے ہے (اہلِ سنت والجماعت میں داخل نہیں)

امت کے مایۂ ناز فقہاء و محدثین مثلاً (۱) علامہ نوویؒ شارح مسلم متوفی ۶۷۶ھ (۲) علامہ ابن تیمیہؒ متوفی ۷۲۸ھ (۳) امام ابراہیم سرخسی مالکیؒ (۴) علامہ سمہودی شافعیؒ (۵) محدث ابنِ حجر شافعیؒ متوفی ۸۵۲ھ (۶) علامہ ابن الہمام حنفی متوفی ۸۶۱ھ (۷) شاہ عبدالحق محدث دہلوی متوفی ۱۰۵۲ھ (۸) شیخ احمد المعروف بملا جیونؒ صاحب تفسیر احمدی متوفی ۱۱۳۰ھ (۹) شاہ ولی اللہ محدث دہلوی متوفی ۱۱۷۶ھ (۱۰) علامہ بحر العلوم عبدالعلی فرنگی محلیؒ متوفی ۱۲۲۵ھ (۱۱) قاضی ثناء اللہ پانی پتی صاحبِ تفسیر مظہری متوفی ۱۲۲۵ھ۔ (۱۲) علامہ سید احمد طحطاوی متوفی ۱۲۳۲ھ وغیرہ کی ان تصریحات و تحقیقات سے یہ بات محقق اور مدلل ہوچکی کہ ائمہ اربعہ ہی کی تقلید پر انحصار کے سلسلہ میں پوری امت کا اجماع ہوچکا ہے لیکن بعض ذہنوں میں اس سلسلہ میں اعتراضات و شبہات ہیں۔ حق طلب حضرات کی تشفی و تسلی کے لیے آئندہ سطور میں ان اعتراضات کے جوابات عرض کیے جاتے ہیں۔

تقلیدِ ائمہ اربعہ کی تخصیص پر پہلا شبہ | مشہور غیر مقلد عالم جناب مولانا نذیر حسین صاحب دہلویؒ نے اپنی کتاب معیار الحق میں شرح مسلم الثبوت سے علامہ قرافی مالکیؒ کا یہ قول نقل

---

[1] طحطاوی علی الدر المختار۔ ص ۱۵۳ ج ۴

کیا ہے:

قال القرافی فی العقد الاجماع علیٰ ان من اسلم فلہ ان یقلد من شاء من العلماء من غیر حجر واجمع الصحابۃ علی ان من استفتیٰ ابابکر وعمر امیری المومنین فلہ ان یستفتی اباھریرۃ ومعاذ بن جبل وغیرھما ویعمل بقولھم من غیر نکیر فمن ادعیٰ برفع ھذین الاجماعین علیہ البیان

ترجمہ: قرافیؒ نے لکھا ہے کہ اس بات پر اجماع منعقد ہوا ہے کہ جو مسلمان ہو جائے اس کے لیے جائز ہے کہ بلا کسی رکاوٹ کے جس عالم کی چاہے تقلید کرے۔ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع ہے کہ جو شخص امیر المومنین حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے مسئلہ پوچھے اس کے لیے یہ بھی جائز ہے کہ ابو ہریرہ اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہما وغیرہ سے بھی مسائل دریافت کرے جو شخص ان دونوں اجماع کے خلاف دعویٰ کرے اس کے ذمے دلیل پیش کرنی ہے۔

یہ عبارت نقل کر کے صاحب معیار الحق تحریر فرماتے ہیں:

"معلوم ہوا کہ منع کرنا ابن صلاح کا تقلید سے غیر ائمہ اربعہ کی اجماع مرکب پر مبنی نہیں بلکہ قول پر امام الحرمین کے اور وہ پھر بھی غلط اور مخالف اجماع صحابہؓ اور اجماع تمام مسلمین کے ہے۔"[1]

علامہ قسرانی مالکیؒ نے اپنے کلام میں دو اجماع کا دعویٰ کیا ہے ایک تو یہ کہ ہر مسلمان کو اختیار ہے کہ وہ جس مجتہد کی چاہے تقلید کرے دوسرا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا یہ اجماع نقل کیا ہے ——— کہ جو شخص حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے مسئلہ معلوم کرتا ہو اسے یہ بھی حق ہے کہ حضرت ابو ہریرہ اور حضرت معاذ بن جبل سے مسئلہ معلوم کرے اور ان کے قول پر عمل کرے۔

شبہ مذکورہ کا جواب اس سلسلہ میں عرض ہے کہ علامہ قسرانیؒ کا نقل کردہ پہلا

[1] معیار الحق ص ۴۴

اجماع اکثر ثقات و محققین کی تصریحات کے خلاف ہے۔ یہ مسئلہ علمائے کرام کے درمیان ہمیشہ اختلافی رہا ہے کہ اگرچند اصحابِ اجتہاد موجود ہوں تو قاصدِ تقلید کو اختیار ہے کہ وہ جس کی چاہے تقلید کرے خواہ وہ مفضول ہی ہو یا ان سب میں افضل کی تقلید ضروری ہے۔ یہ دو نقطۂ نظر ہیں دونوں ہی کے قائلین میں علمائے اکرام کا ایک معتدبہ گروہ شامل ہے۔

علامہ سید سمہودیؒ اس مسئلہ پر مفصل بحث کرتے ہوئے مختلف علماء کے اقوال نقل کرتے ہیں:

اذا تعدد من یصلح للتقلید فھل یلزم مریدَہٗ ان یجتھد فیسأل اعلمھم وجھان قال ابن شریح نعم واختارہٗ ابن کج والقفال لانہٗ یسھل علیہ ھذا القدر من الاجتھاد واصحھما عند الجمھور انہ یتخیر فیسأل من شاء لان الاولین کانوا یسألون علماء الصحابۃ رضی اللہ تعالیٰ عنھم مع تفاوتھم فی العلم والفضل ویعملون بقول من شاؤا من غیر نکیر وقال الغزالی وان اعتقد احدھم اعلم لم یجز ان یقلد غیرہٗ وان کان لا یلزمہ البحث عن الاعلم اذا لم یعلم اختصاص احدھم بزیدۃ علم قال

ترجمہ: جب صلاحیت اجتہاد رکھنے والے متعدد حضرات موجود ہوں تو کیا طالبِ تقلید کے لیے لازم ہے کہ معلوم کرکے سب میں اعلم کی تقلید کرے؟ اس سلسلہ میں دو نظریے ہیں۔ ابن شریح فرماتے ہیں۔ ہاں یہی لازم ہے اسی کو ابن کجؒ اور قفالؒ نے بھی اختیار کیا ہے کیوں کہ طالبِ تقلید کے لیے اعلم کی تحقیق چنداں دشوار نہیں ہے لیکن جمہور کے نزدیک صحیح نظریہ یہ ہے کہ طالب کو اختیار ہے کہ وہ جس کی چاہے تقلید کرے کیوں کہ پہلے حضرات علماء صحابہؓ کرامؓ سے دریافت کیا کرتے تھے اور بلا کسی نکیر کے جس کے قول پر چاہتے تھے عمل کرتے تھے۔ حالانکہ حضراتِ صحابہؓ میں باہم علم و فضل کے اعتبار سے تفاوت تھا۔ امام غزالیؒ نے فرمایا ہے

فی زوائد الروضة هٰذا الذی قال الغزالی قد قال غیره ایضًا وهو ان کان ظاهرًا ففیه نظرٌ لما ذکرنا من سوال احاد الصحابة رضی الله تعالٰی عنهم مع وجود افاضلهم الذین فضلهم متواتر وقد یمنع هٰذا وعلی الجملة المختار ما ذکره الغزالی فعلی هٰذا یلزمه تقلید اورع العالمین واعلم الورعین وان تعارضا قدّم الاعلم علی الاصح انتهٰی وقال العلی القاری فی رسالة المصنفة فی بیان جواز الاقتداء بالمخالف من اسلم اوتاب عن المعاصی والتزم احکام الشرع فلهٗ ان یختار من المذاهب ای مذهب شاء اذا تعدد المجتهدون فی البلد علی قول من جوز تقلید المفضول مع وجود الافضل واما علی قول من عیّن تقلید الفاضل وهو الاحوط فعلیه ان یبحث ویتبع الفاضل[1]

اگر آدمی کسی کو اعلم سمجھتا ہے تو اس کے لیے جائز نہیں ہے کہ اس کے غیر کی تقلید کرے اگرچہ اس کے ذمہ اعلم ہونے کی تحقیق ضروری نہیں ہے جب کہ وہ کسی کے زیادتی علم سے اختصاص کی پرکھ نہ رکھتا ہو۔ زوائد الروضہ میں لکھا ہے کہ یہ جو غزالیؒ نے کہا ہے۔ اسی کو بعض دوسرے لوگوں نے بھی کہا ہے۔ یہ بات اگرچہ ظاہر ہے۔ لیکن اس میں کچھ خلجان ہے۔ جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے کہ مختلف حضرات صحابہ کرامؓ سے سوالات کیے جاتے تھے حالاں کہ ان کے وہ افاضل بھی موجود تھے جن کا فضل متواتر ہے۔ لیکن یہ چیز بعض دفعہ ممنوع ہوتی ہے۔ خلاصہ کلام مختار وہی ہے جس کو غزالیؒ نے ذکر کیا۔ تو اس صورت میں آدمی علماء میں سب سے پرہیزگار اور متقیوں میں سب سے اعلم کی تقلید لازم ہوگی اور اگر اورع اور اعلم میں تعارض ہو تو اصح یہ ہے کہ اعلم ہی قابلِ ترجیح ہوگا۔ ملا علی قاریؒ نے مخالف کی اقتداء کے جواز کے سلسلہ میں اپنے رسالہ کے اندر لکھا ہے کہ جو شخص مسلمان ہوا یا معاصی سے تائب ہوکر احکام شرع کا

[1] العقد الفرید بحوالہ انتصار الحق ص ۹۲-۹۳۔

متبع بن گیا۔ اس کے لیے اس قول کی بنا پر کہ "افضل کی موجودگی میں مفضول کی تقلید درست ہے" یہ جائز ہوگا کہ شہر کے مختلف مجتہدین میں سے جس کی چاہے تقلید کرے۔ لیکن ان حضرات کے قول کے اعتبار سے جو افضل ہی کی تقلید ضروری قرار دیتے ہیں اور یہی احوط بھی ہے۔ عمل کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ افضل ہی کی تحقیق و تلاش کرے۔

الحاصل اس قدر علمائے کرام کی مخالفت کے باوجود مسئلہ زیرِ بحث پر علامہ قرافی رح کے لیے "اجماع" کا دعویٰ کرنا کس طرح درست ہو سکتا ہے؟

علامہ قرافی رح نے جو دوسرا دعویٰ کیا ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے زمانے میں یہ اجماع ہو چکا ہے کہ جو شخص حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے فتویٰ پوچھے تو اس کے لیے جائز ہے کہ اس کے بعد حضرت ابو ہریرہ اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہما سے بھی مسائل پوچھ سکتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس سلسلہ میں صحابۂ کرامؓ کا اجماع قولی تو کوئی منقول اور ثابت نہیں۔ ہاں محض سکوت اور عدم انکار کی بنیاد پر اجماع سکوتی کا دعویٰ کیا جائے تو یہ بھی محل نظر ہے کیوں کہ جب تک رضامندی اور تحسین کے قرائن نہ پائے جائیں محض سکوت سے اجماع منعقد نہیں ہوتا کیوں کہ اس بات کا مکمل امکان ہے کہ سکوت بعض دیگر مصالح کی بنیاد پر ہو جیسا کہ صاحبِ تلویح فرماتے ہیں:

وقد یکون سکوت المجتهد التأمل وغیرہ کاعتقاد حقیة کل مجتهد او کون القائل اکبر سنًا او اعظم

ترجمہ: کبھی مجتہد کا سکوت اختیار کرنا تامل یا کسی اور بنا پر ہوتا ہے مثلاً ہر مجتہد کے حق ہونے کا اعتقاد یا کہنے والے کا بڑا

قدرًا او اوفر علما او استقرار الخلاف حتی لو حضر مجتهد الحنفية والشافعية وتكلم احدهم بما يوافق مذهبه وسكت الآخرون لم يكن اجماعًا ولا يحمل سكوتهم على الرضاء لتقرر الخلاف [1]

یا عالی قدر یا زبردست صاحبِ علم ہونا یا اختلاف ثابت و مشہور ہونا۔ چنانچہ اگر احناف و شوافع کے مجتہدین موجود ہوں اور ان میں سے کوئی ایک اپنے مذہب کے مطابق گفتگو کرے اور دوسرے سکوت اختیار کریں تو اسے اجماع نہیں کہیں گے اور ان کا سکوت رضا پر محمول نہیں ہوگا کیونکہ اختلافات مشہور ہیں۔

⁂ ⁂ ⁂

تو اس بات کا قوی امکان ہے کہ مسئلہ زیر بحث میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے عدمِ انکار کی وجہ محض یہ ہو کہ مجتہدین صحابۂ کرام رضؓ کے مذاہب مدون اور حوادثِ واردہ کو مکمل حاوی نہ تھے۔ اس صورت میں اگر سائل کو کسی خاص صحابیؓ کے فتاویٰ پر مقید کیا جاتا تو حرجِ عظیم واقع ہوتا اور اس کی بہت سی دینی ضروریات تشنۂ تکمیل رہ جاتیں۔ بخلاف زمانۂ ائمہ اربعہ کے کہ ان حضرات کے مذاہب پیش آمدہ تمام حوادث و مسائل کو کلیۃً یا جزئیۃً حاوی ہیں۔ الحاصل صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے محض سکوت اور عدم انکار سے "اجماع" کا انعقاد مستبعد ہے۔

اور اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ صحابۂ کرام کا مسئلہ مذکورہ میں اجماع تھا تو یہ بربنائے ضرورت تھا اور انہیں حضرات کے زمانے کے ساتھ خاص تھا۔ کیوں کہ حضرات صحابہؓ کے مذاہب غیر مدون اور ان کے اصول و ضوابط غیر منضبط تھے۔ ان کے اقوال و فتاویٰ تمام حوادث و وقائع کے احکام پر حاوی نہ تھے۔ اس لیے ضرورت متقاضی تھی کہ کسی بھی طالب کو کسی خاص مجتہد پر منحصر نہ رکھا جائے۔ بعد کے ادوار میں یہ ضرورت مرتفع ہوگئی اس لیے بربنائے ضرورت جو اجماع تھا وہ بھی باقی نہ رہا۔

---

[1] حوالہ: انتصار الحق ص ۱۲ مصنفہ مولانا ارشاد حسین صاحب رامپوری رح

صاحب مدارالحق رح فرماتے ہیں:

ان الناس کانوا فی عہد الصحابۃ رض غیر ملتزمین مذہب احد لا حل الضرورۃ المذکورۃ فانتہی الحکم بانتہاء العلۃ [1]

ترجمہ: بے شک لوگ عہد صحابہ رض میں ضرورۃ مذکورہ کی وجہ سے کسی ایک مذہب پر مجتمع نہیں تھے۔ اب اس علت کے نہ رہ جانے کی وجہ سے حکم بھی نہیں رہا۔

علامہ شیخ شرف الاسلام ابوالفتح بغدادی الشافعی رح کتاب الاصول میں تحریر فرماتے ہیں:

اما قولہم ان الصحابۃ رض ما کلفوا العوام تقلید واحد معین فانما جاز ذالک لانہ لم یظہر لکل منہم الاصول والقواعد ما یفی باحکام الحوادث والوقائع فانہم اشتغلوا بتوسیع الخطۃ وخصہم اللہ تعالے بتلک الفضیلۃ واتاح .....

.....

لمن جاء بعدہم بفضلہ تہذیب الاصول وتفریع المسائل [2]

ترجمہ: رہا لوگوں کا یہ کہنا کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عوام کو واحد معین کی تقلید کا مکلف نہیں کیا تھا۔ تو یہ اس لیے جائز تھا کہ ان حضرات میں سے کسی کے بھی اصول و قواعد سامنے نہیں آئے تھے جو احکام حوادث اور وقائع کے سلسلہ میں کافی ہوتے کیوں کہ وہ فتوحات اسلامیہ میں مشغول تھے اور یہ فضیلت خدا نے انھیں کے حصہ میں رکھی تھی۔ اور ان کے بعد والوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے تہذیب اور تفریع مسائل کی توفیق مرحمت فرمائی۔

صاحب مدارالحق رح ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

فان قیل الیس فی عہد الصحابۃ کان الواحد من الناس مخیراً

ترجمہ: اگر یہ کہا جائے کہ کیا صحابہ کرام رض میں یہ نہیں تھا کہ کسی بھی انسان کو اختیار تھا کہ وہ بعض مسائل میں

---

[1] مدارالحق ص ۳۲۰ [2] بحوالہ انتصار الحق ص ۹۴

بین ان یاخذ فی بعض الوقائع بمذهب الصدیق الاکبرؓ فی بعض آخر بمذهب الفاروق قلت انما کان کذالک لان اصول الصحابة لم تکن کافیة لعامة الوقائع ولا شاملة لکافة المسائل لانهم لم یتفرغوا الی تفریع التفاریع وتمهید الاصول وتفاصیل فلاجل الضرورة یحل للمقلد اتباع الصدیق الاکبرؓ فی بعض الوقائع واتباع الفاروقؓ فی بعضها واما فی زماننا هذا فمذاهب الائمة کافیة بمعرفة الکل فلا ضرورة الی اتباع الامامین[1]۔

صدیق اکبرؓ کے مسلک کو اختیار کرے اور بعض دوسرے مسائل میں فاروق اعظمؓ کے مسلک پر چلے۔ تو میں یہ کہوں گا کہ یہ اس بنا پر تھا کہ صحابۂ کرامؓ کے اصول عام واقعات اور تمام مسائل کو حاوی نہیں تھے کیونکہ ان حضرات کو اصول و تفاصیل بیان کرنے تفریعات متفرع کرنے کی فراغت نہیں تھی تو اس ضرورت کی بنا پر مقلد کے لیے درست تھا بعض معاملات میں کہ صدیق اکبرؓ اور بعض دوسرے معاملات میں فاروق اعظمؓ کی تقلید کرے اب ہمارے زمانے میں مذاہب اربعہ تمام مسائل کی معرفت کے لیے کافی ہیں اس لیے دو اماموں کی تقلید کرنے کی ضرورت نہیں رہ گئی۔

تقلید ائمۂ اربعہ پر دوسرا شبہ | بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ جب ائمۂ اربعہ میں سے ہر ایک نے فرمایا ہے کہ "اذا صح الحدیث فهو مذهبی"، یعنی جب ہمارے قول کے برخلاف کوئی حدیث مل جائے تو چاہیے کہ حدیث ہی پر عمل کیا جائے کہ وہی ہمارا مذہب ہے۔ اس قول میں ان حضرات نے خود اپنی تقلید کلی سے منع فرما دیا ہے۔ پھر لوگ انھیں کی تقلید پر کیوں مصر ہیں؟

شبہ ثانیہ کا جواب | اس شبہ کے جواب میں صاحب نظام الاسلام حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ تحقیق نقل فرماتے ہیں:

[1] حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۲۹ ج ۱

"بعضے علماء نے مولانا شاہ عبدالعزیز قدس سرہٗ کی روایت سے یوں لکھا ہے۔ چاروں مجتہدوں نے جو فرمایا ہے کہ جو کوئی ہمارے قول کو برخلاف حدیث صحیح کے پاوے تو چاہیے کہ وہ حدیث پر عمل کرے کہ فی الحقیقت ہمارا مذہب یہی ہے تو یہ کہنا انکا ان کے زمانے سے علاقہ رکھتا ہے۔ کیوں کہ ان کے بعد اجتہاد جاتا رہا تقلید لازم ہوئی اس لیے بعد ان کے جتنے علماء گزرے باوجودیکہ ان کو مسائل کے نکالنے کی قوت اور کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کا علم اور فقیہوں کے اختلاف کی شناسائی تھی پھر بھی وہ اجتہاد کی راہ نہ چلے اسی واسطے کہ جیسی سمجھ کی مضبوطی اور غور کی قوت اور دل کی صفائی اور قلب کی روشنی اور بے طمعی اور نیت کے درستی اور خواہش نفسانی سے دوری اور پرہیزگاری اور سلیقہ عربی زبان کی بوجھ کا قدیم لغتوں کے موافق ان مجتہدوں میں تھی اپنی ذات میں انھوں نے نہ پائی اور ویسی تحقیقات اور تلاش اور قوت مسائل کے نکالنے کی انھیں حاصل نہ ہوئی۔ اور مسئلوں کے نادرست اور درست کرنے میں کوئی دوسری راہ سوائے ان لوگوں کے مقرر کی ہوئی میسر نہ آئی۔ حکم کیا اجتہاد کے حرام ہونے اور چاروں اماموں کے تقلید کے واجب ٹھہر جانے پر اور اللہ تعالیٰ ان پر رحمت کرے کہ اچھے طریقے اور مضبوط راہ پر چلے کہ جن میں بہت باتیں نیک پائی جاتی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ لوگوں کی سرشت میں یہ بات ہے کہ ہر شخص اپنی سمجھ پر نازاں ہوتا ہے اور دوسرے کے کمال کو اگرچہ مجملاً اس پر اعتقاد رکھتا ہو پھر بھی بسبب اس کے دل میں ایک بات ٹھہر رہی ہے اچھی بات کو بھی ان کی قبول نہیں کرتا پھر اپنے برابر کے لوگوں کے قول کا کیا ٹھکانہ۔ پس اس صورت میں اگر کوئی شخص اجتہاد کی شرطیں حاصل کر کے خلاف عقلوں کے احکام جاری کرتا تو ہر کوئی کیا ناقص اور کیا متوسط۔ اپنی استعداد کے موافق ایک نئی راہ پر چلنے لگتا۔ اس میں یہاں تک اختلاف واقع ہوتا کہ جمعیت شریعت کے احکام کی عبادات اور معاملات کے مقدمہ میں باقی نہ رہتی اور لوٹ جاتی اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا

دروازہ بند ہو جاتا چنانچہ جب تک چار مذہب پر لوگ مضبوط نہیں ہوئے تھے اور ان کی پیروی اختیار نہیں کی تھی سنّی اور کئی فرقے ہو گئے تھے اور ان کے تابعدار باقی رہ گئے۔ مگر بعد اس کے جب علماؤں نے ان چار مذہبوں کو خوب مضبوط کیا اور ان کے موافق احکام کو ہر طرف جاری فرمایا اور ایک نیا مذہب بنانے کو باطل اور حرام ٹھیرایا تب ان چار کے سوا دوسرا مذہب کسی نے نہ نکالا اور شاید کسی نے نکالا ہو تو بسبب اجماعِ علمائے دین دار کے اور مدد سے بادشاہ دین پناہ کے جاری اور رواج نہ ہونے پایا۔[1]"

اللہ کا بے پناہ شکر و احسان ہے کہ تقلید ائمہ اربعہ کے سلسلہ میں اکابرِ امت کی تحقیقات و تصریحات کا ایک ضروری حصّہ پیش کر دیا گیا جو ان شاء اللہ اربابِ فہم و صلاح کے لیے حقیقتِ مسئلہ کے ادراک صحیح میں ممد و معاون ثابت ہوگا۔

اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اِتِّبَاعَہٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اِجْتِنَابَہٗ

❊ ❊ ❊

---

[1] نظام الاسلام ص ۵ - ۱۵

بابت سنہ ۱۴۱۶ھ

پانچواں محاضرہ علمیہ

برموضوع

پیش کردہ

جناب مولانا محمد راشد صاحب اعظمی

استاذ فقہ دارالعلوم دیوبند

فہرست مضامین

حقیقت تراویح ۳

تراویح اور تہجد دونوں الگ الگ نمازیں ہیں ۴

تراویح کا ثبوت ۴

تراویح کا اجراء بیس رکعات کے ساتھ ۶

مسئلہ تراویح پر تحقیقی نظر ۱۲

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے رکعات تراویح کا صراحتہ ثبوت ۱۸

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کیطرف آٹھ رکعت تراویح کی نسبت ثابت نہیں ہے ۲۰

بیس رکعت تراویح پر جمہور امت کا اجماع ۲۲

ائمہ اربعہ بھی بیس ہی کے قائل ہیں ۲۴

چھتیس چالیس اور اٹھائیس رکعات کی توجیہ ۲۵

مسئلہ تراویح پر ایک اصولی گفتگو ۲۷

مسئلہ طلاق ثلثہ ۲۸

جمہور امت کے دلائل ۳۲

مخالفین کے دلائل ۴۲

کاتب:۔ احسان الٰہی کاتل نزد معراج گیٹ دارالعلوم دیوبند

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وکفیٰ وسلامٌ علی عبادہ الذین اصطفیٰ اما بعد

منجملہ ان تمام مسائل عملیہ کے جن میں فرقہ غیر مقلدین نے جمہور اہل سنت والجماعت کی شاہراہ مستقیم سے انحراف کرکے راہ شذوذ اختیار کرلیا ہے اور جو اِن کے اور اہل سنت والجماعت کے مابین وجہ امتیاز بن چکے ہیں۔ یہ دو مسئلے نہایت اہم اور مشہور ہیں۔ ۱ مسئلہ تراویح ۲ مسئلہ طلاق ثلثہ۔

اس موقع پر قدرے تفصیل کے ساتھ ان دونوں مسئلوں پر کچھ عرض کیا جاتا ہے۔

"حقیقت تراویح"

مسئلہ تراویح میں نقطۂ اختلاف پر غور کرنے سے قبل نفس تراویح کی حقیقت ذہن نشین رکھنی مناسب ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رح فتح الباری میں فرماتے ہیں۔

سُمِّیَتِ الصَّلٰوۃُ فی الجماعۃِ فی لیالِی رمضانَ التراویح [۱] یعنی جو نماز رمضان المبارک میں جماعت کے ساتھ ادا کی جائے اس کا نام تراویح ہے۔

اس تعریف کی روشنی میں یہ دو باتیں بطور خاص ملحوظ رکھنی چاہئیں (۱) تراویح نماز باجماعت کو کہتے ہیں۔ (۲) وہ رمضان المبارک کی راتوں کے ساتھ خاص ہے۔ غیر مقلد عالم حافظ عبداللہ غازی پوری لکھتے ہیں "نماز تراویح وہ نماز ہے جو رمضان المبارک کی راتوں میں عشاء کے بعد پڑھی جائے۔ [۲]

---

[۱] فتح الباری ص ۱۸۷ ج ۴ [۲] تنبیہ رکعات التراویح ص

"تراویح اور تہجد دونوں الگ الگ نمازیں ہیں"

"قیامُ اللیل" اور "صلوٰۃُ اللیل" یہ دونوں عام لفظ ہیں جن کے تحت دو نمازیں آتی ہیں ایک تراویح اور دوسری تہجد۔ اس باب میں وارد تمام احادیث پر غور کرنے سے یہ فرق بخوبی واضح ہوتا ہے۔ چنانچہ علمائے محققین نے ان دونوں کا مابین فرق کی صراحت کی ہے علامہ ابن قدامہ مالکیؒ المقنع میں فرماتے ہیں۔

ثم التراویح وھی عشرون رکعۃً	پھر تراویح ہے اور اس کی بیس رکعتیں ہیں
یقوم بھا فی رمضان فی جماعۃٍ ویوتر	جنہیں رمضان میں باجماعت ادا کرے ا
بعدھا فی الجماعۃ فان کان لہ	اسکے بعد وتر باجماعت ادا کرے اور اگر
تھجدٌ جعل الوتر بعدہ [1]	تہجد کا عادی ہو تو وتر تہجد کے بعد ادا کرے

اس عبارت سے صاف واضح ہے کہ تراویح اور تہجد دونوں الگ الگ ہیں۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے اپنے فتاویٰ میں[2]۔ حضرت گنگوہیؒ نے "رسالہ تراویح"[3] اور حضرت نانوتویؒ نے اپنے مکاتیب[4] میں ان دونوں کے فرق کو بدلائل واضح کیا ہے

"تراویح کا ثبوت"

عن عروۃ اَنَّ عائشۃ رضؓ اخبرتہٗ	عروہ روایت کرتے ہیں کہ انہیں حضرت عائ
انَّ رسولَ اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم	نے خبر دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک
خرجَ لیلۃً مِنْ جوفِ اللیلِ فصلّی فی	دفعہ وسط شب میں باہر تشریف لائے ا
المسجد وصلّی رجالٌ بصلوٰتہٖ	مسجد میں نماز ادا فرمائی اور بہت سے لوگو

[1] المقنع ص ۱۸۷-۱۸۸ ج ۱ [2] فتاویٰ عزیزی ص ۱۱۹-۱۲۰ ج ۱ [3] رسالہ تراویح مندرجہ تالیفات رشیدیہ ص ۳۰۶۔ [4] لطائف قاسمی ص ۷

اصبح الناس فتحدثوا فاجتمع
لثر منهم فصلی فصلوا معہ فاصبح
لناس فتحدثوا فکثر اھل المسجد
ن اللیلۃ الثالثۃ فخرج رسول
للہ صلی اللہ علیہ وسلم فصلی
صلوا بصلاتہ فلما کانت اللیلۃ
رابعۃ عجز المسجد عن اھلہ حتی
رج لصلوۃ الصبح فلما قضی الفجر
قبل علی الناس فتشھد ثم قال
ما بعد فانہ لم یخف علی مکانکم
لکنی خشیت ان تفرض علیکم
تعجزوا عنھا فتوفی رسول اللہ
لی اللہ علیہ وسلم والامر علی
ذالک۔

(صحیح البخاری ص ۲۶۹ ج ۱۔)
(صحیح مسلم ص ۲۵۹ ج ۱)

آپؐ کی نماز کی اقتدا کی۔ لوگوں نے صبح دوسرے لوگوں سے اسکا تذکرہ کیا تو دوسری رات اس سے زیادہ لوگ جمع ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی اور ان لوگوں نے حضورؐ کی اقتدا کی۔ صبح پھر ان لوگوں نے تذکرہ کیا تو تیسری رات اہل مسجد اور زیادہ ہو گئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے اور نماز ادا کی دوسروں نے آپ کی اقتدا کی پھر چوتھی رات مسجد نمازیوں کی کثرت سے تنگ ہو گئی۔ یہاں تک کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز صبح کے لئے تشریف لائے۔ فجر ادا کر کے لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر تشہد پڑھا پھر فرمایا اما بعد بے شک تمہارا حال مجھ پر پوشیدہ نہیں تھا لیکن مجھے خوف ہوا کہ وہ تم پر فرض کر دی جائے اور تم اسکی بنا پر عاجز ہو جاؤ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک معاملہ یوں ہی رہا۔

اس روایت سے پتہ چلا کہ رمضان المبارک میں تین دن تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو تراویح پڑھائی پھر لوگوں کے شدتِ ذوق وشوق کو دیکھکر اس اندیشہ سے پڑھانا ترک فرما دیا کہ کہیں فرض نہ ہو جائے کہ لوگوں کو مشقت ہوگی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت پر غایتِ شفقت اور رحمت کی بنیاد پر ایسا فرمایا۔ یہاں یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیئے کہ تراویح کا ثبوت حدیث مذکورہ وغیرہا سے ہجرت کے بعد ہوا۔

اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں اس کیفیت کے ساتھ یہ معاملہ صرف تین راتوں تک رہا جبکہ نماز تہجد کا ثبوت "آیت کریمہ یَا اَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا (المزمل) اور آیت ومن اللیل فتھجد بہ نافلۃ لک (سورہ اسراء) سے ہجرت سے قبل ہوا تھا۔ (مزید تحقیق کیلئے ملاحظہ ہو رسالہ تراویح مندرجہ تالیفات رشیدیہ ص ۲۰۶-۲۰۷)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں داخلی اور خارجی فتنوں کی کثرت اور مدت خلافت کی قلت کی بنا پر اس سنتِ عظیمہ کے قیام کا موقع نہ مل سکا۔ لیکن سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں اس سنت کو جو عارض مذکور کی بنا پر موقوف تھی لیکن اب وہ عارض چونکہ باقی نہیں رہا تھا اس لئے جاری فرمادیا۔ گویا کہ یہ سعادت عظیمہ حضرت فاروق اعظم ہی کے لئے مقدر تھی ملا علی قاری رح علامہ طیبی رح کے حوالے سے نقل کرتے ہیں۔

وَاِنْ کَانَتْ لَمْ تَکُنْ فِیْ عَھْدِ اَبِیْ بَکْرٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ فَقَدْ صَلَّاھَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَاِنَّمَا قَطَعَھَا اِشْفَاقًا مِنْ اَنْ تُفْرَضَ عَلٰی اُمَّتِہٖ وَکَانَ عُمَرُ مِمَّنْ تَنَبَّہَ عَلَیْھَا وَسَنَّھَا عَلَی الدَّوَامِ فَلَہٗ اَجْرُھَا وَاَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِھَا اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ۔

(مرقات ص ۱۹۲ ج ۳)

اگرچہ تراویح باجماعت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں نہیں تھیں لیکن چونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پڑھا تھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں تھے جو اس حقیقت سے باخبر تھے انہوں نے دائمی طور پر جاری فرمادیا تو انھیں اس کا بھی اجر ہے اور قیامت تک جو لوگ عمل کرتے رہیں گے ان کا بھی اجر ہے۔

"تراویح کا اجرا بیس رکعات کے ساتھ"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں تراویح بیس رکعات کے ساتھ

باجماعت جاری فرمایا۔ مندرجہ ذیل روایات سے اس کا واضح ثبوت ہوتا ہے۔

(۱) بیہقیؒ کی سنن کبری میں ہے۔

وَقَدْ اَخْبَرَنَا اَبُوعَبْدِ اللّٰہِ الْحُسَیْنُ بْنُ مُحَمَّدِ بْنِ الْحُسَیْنِ بْنِ فَنْجَوَیْہِ الدِّیْنَوَرِیُّ بِالدَّامِغَانِ ثَنَا اَحْمَدُ بْنُ مُحَمَّدِ بْنِ اِسْحٰقَ السُّنِّیُّ ثَنَا عَبْدُ اللّٰہِ بْنُ مُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِ الْعَزِیْزِ الْبَغَوِیُّ ثَنَا عَلِیُّ بْنُ الْجَعْدِ اَنْبَاَنَا ابْنُ اَبِیْ ذِئْبٍ عَنْ یَزِیْدَ بْنِ خُصَیْفَۃَ عَنِ السَّائِبِ بْنِ یَزِیْدَ قَالَ کَانُوْا یَقُوْمُوْنَ عَلٰی عَھْدِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ فِیْ شَھْرِ رَمَضَانَ بِعِشْرِیْنَ رَکْعَۃً[۲]	ہمیں خبر دی ابو عبداللہ حسین ابن محمد بن حسین بن فنجویہ دنیوری نے دامغان میں انہوں نے کہا ہم سے حدیث بیان کی محمد بن اسحٰق سنی نے انہوں نے کہا ہم سے بیان کیا عبداللہ بن محمد بن عبدالعزیز بغوی نے انہوں نے کہا ہم سے بیان کیا علی بن الجعد نے انہوں نے کہا ہمیں خبر دی ابن ابی ذئب نے یزید بن خصیفہ سے انہوں نے روایت کی سائب ابن یزید سے کہ لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں رمضان المبارک کے اندر بیس رکعت تراویح پڑھتے تھے

محدث نیمویؒ اس اثر کے رجال کے سلسلہ میں فرماتے ہیں رجال اسنادہٖ کلھم ثقات[۳] اس کی اسناد کے تمام راوی ثقات ہیں۔ پھر حافظ ذہبیؒ کی تذکرۃ الحفاظ۔ طبقات الحفاظ حافظ ابن حجرؒ کی تقریب التہذیب نووی ؒ کی الخلاصۃ ابن العراقیؒ کی شرح التقریب سیوطیؒ کی المصابیح کے حوالہ سے ایک ایک راوی کی توثیق و تصحیح نقل کی ہے۔ (ملاحظہ ہو التعلیق الحسن ص ۵۴ ج ۲)

(۲) یہی روایت امام بیہقی نے معرفۃ السنن والآثار میں یزید ابن خصیفہ کے دوسرے شاگرد محمد ابن جعفر سے نقل کی ہے۔ اسکی سند کو علامہ سبکیؒ نے شرح منہاج اور

---

[۲] آثار السنن والتعلیق الحسن ص ۵۳، ۵۴ ج ۲ ۔ [۳] التعلیق الحسن ص ۵۴ ج ۲ ۔

ملا علی قاری رحؒ نے شرح موطا میں صحیح قرار دیا ہے محدث نیمویؒ فرماتے ہیں" وھذا الاثر من ھذا الوجہ قد صحح اسنادہ العلامۃ السبکی فی شرح المنھاج وعلی القاری فی شرح الموطا۔ (التعلیق الحسن علی آثار السنن ص ۵۵ ج ۲)

یزید ابن خصیفہ کے دونوں شاگرد ۱ محمد بن جعفر ۲ ابن ابی ذئب متفق اللفظ ہیں کہ وہ سائب ابن یزید سے روایت کرتے ہیں کہ لوگ عہد فاروقی میں بیس رکعات پڑھتے تھے۔

(۳) موطا امام مالکؒ میں ہے

عَنْ یزیدَ ابنِ رُوْمَانَ کان الناسُ یقُوْمُوْنَ فی زمانِ عُمَرَ بنِ الخطابِ فی رمضانَ بثلاثٍ وعشرینَ رکعۃً (موطا امام مالک

یزید ابن رومان سے مروی ہے کہ لوگ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے زمانے میں رمضان المبارک میں ۲۳ رکعتیں پڑھتے تھے۔

(۴) عن عبدِ العزیز بن رفیعٍ قال کان ابیُّ ابن کعبٍ یُصلی بالناسِ فی رَمضانَ بالمدِیْنۃِ عشرینَ رکعۃً ویُوترُ بثلاثٍ اَخرجہُ ابوبکر بنُ ابی شیبۃ فی مُصنَّفِہٖ واسنادہ مُرسلٌ قویٌّ (آثار السنن ص ۵۵ ج ۲)

عبد العزیز ابن رفیع سے مروی ہے کہ ابی ابن کعبؓ لوگوں کو رمضان المبارک میں مدینہ شریف کے اندر بیس رکعات اور تین وتر پڑھاتے تھے اس روایت کو ابوبکر ابن ابی شیبہؒ نے اپنے مصنّف میں بیان کیا ہے اور اس کی سند قوی مرسل ہے۔

(۵) عَنْ یحییٰ بنِ سعیدٍ اَنّ عُمَرَ بْنَ الخطابِؓ اَمَرَ رَجُلاً یُصلّی بھم عشرینَ رکعۃً رواہُ ابوبکر

یحییٰ ابن سعید سے مروی ہے کہ عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی کو حکم دیا کہ لوگوں کو بیس رکعات پڑھائے

بنُ ابی شیبۃَ فی مُصَنَّفِہٖ واسنادُہٗ مُرْسَلٌ قویٌ۔

اس روایت کو ابوبکر ابن ابی شیبہ نے اپنے مصنف میں بیان کیا اور اس کی سند مرسل قوی ہے۔

(آثار السنن ص ۵۵ ج ۱)

ان پانچ آثار میں سے پہلا اور دوسرا اثر تو صحیح اسناد کے ساتھ مروی ہے۔ محدث نیموی رح نے "آثار السنن" میں۔ اور مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی رح نے "رکعات تراویح" میں ان دونوں کے رواۃ کی محدثانہ تحقیق کر کے کتب اسمائے رجال سے توثیق کی ہے۔ مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری رح نے پہلی روایت کے راوی اول ابو عبداللہ بن فنجویہ۔ اور دوسری روایت کے دو راوی ۱ ابو ظاہر ۲ ابو عثمان پر واہی اعتراض کئے ہیں جن کا مولانا اعظمی رح نے نہایت ہی کافی اور شافی جواب دیا ہے۔ (ملاحظہ ہو رکعات تراویح ص ۴۱ تا ۴۹)

تیسرا اثر مرسل ہے اس لئے کہ یزید ابن رومان نے حضرت عمر رض کا زمانہ نہیں پایا۔ لیکن یہ مرسل چونکہ موطا امام مالک رح میں ہے اور موطا کے مراسیل روایات متصلہ کا درجہ رکھتے ہیں۔

حضرت ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

قالَ الشافِعیُّ رح اَصَحُّ الکتبِ بعدَ کتابِ اللّٰہِ المُوطا مالکٌ رح واتفقَ اھلُ الحدیثِ علیٰ اَنَّ جمیعَ ما فیہِ صحیحٌ علیٰ رأیِ مالکٍ ومَنْ وافقَہٗ واما علیٰ رأیِ غیرِہٖ فلیسَ فیہِ مُرسلٌ ولا مُنقطعٌ اِلا قد اتصلَ السندُ بہٖ من طرقٍ اخریٰ

حضرت امام شافعی رح فرماتے ہیں کتاب اللہ کے بعد سب کتابوں میں زیادہ صحیح کتاب امام مالک کی موطا ہے اور اہل حدیث متفق ہیں کہ امام مالک اور ان کے موافقین کی رائے کے مطابق موطا کی تمام احادیث صحیح ہیں (اس لئے کہ وہ لوگ مرسل کو بھی صحیح اور مقبول مانتے ہیں) اور دوسرے

فَلَاجَرَمَ اَنَّهَا صحیحةٌ مِنْ هٰذَا الْوَجْهِ وقد صُنِّفَ فی زمانِ مالكٍ مؤطاتٌ كثيرةٌ فی تخريجِ اَحَادِيثِهٖ وَوَصْلِ مُنْقَطِعِهٖ مِثْلُ كتابِ ابنِ ابی ذئبٍ وابن عُيينةَ والثَّوْرِيِّ ومعمرٍ

(حجۃ اللہ البالغۃ ص ۳۱۳ ج ۱)

محدثین کی رائے کے مطابق اس میں کوئی مرسل اور منقطع حدیث ایسی نہیں ہے کہ دیگر طرق سے اسکی سند متصل نہ ہو پس اسوجہ سے مؤطا کی تمام احادیث صحیح ہی ہیں۔ امام مالکؒ کے زمانے میں بہت سی مؤطا تصنیف ہوئیں جن میں موطا امام مالک کی احادیث کی تخریج کی گئی اور اس کی منقطع احادیث کو متصل کیا گیا جیسے ابن ابی ذئب ابن عیینہ ثوری اور معمر وغیرہ کی کتابیں۔

اس سلسلہ میں دوسری بات یہ ہے کہ ثقہ کا مرسل تو امام مالکؒ اور امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک مطلقا مقبول ہے خطیب بغدادیؒ کفایہ میں لکھتے ہیں۔

فَقَالَ بَعْضُهُمْ اَنَّهٗ مَقْبُوْلٌ وَيَجِبُ الْعَمَلُ بِهٖ اِذَا كَانَ الْمُرْسِلُ ثِقَةً عَدْلًا وَهُوَ قَوْلُ مالكٍ واهلِ الْمَدِيْنَةِ وَاَبِیْ حَنِيْفَةَ واهلِ الْعِرَاقِ وَغَيْرِهِمْ

بعض علمانے فرمایا کہ مرسل مقبول ہے اور اس پر عمل کرنا واجب ہے جب ارسال کرنے والا ثقہ اور عدل ہو یہی امام مالکؒ اہل مدینہ امام ابوحنیفہؒ اور اہل عراق وغیرہ کا قول ہے۔

(کفایہ ص ۳۸۴ بحوالہ رکعات تراویح ص ۴۶)

حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک مرسل اگرچہ مقبول نہیں ہے لیکن اس مرسل کی تائید دوسرے طریق سے مروی کسی مرسل یا مسند سے ہو جائے تو پھر وہ مقبول ہے علامہ ابن حجرؒ شرح نخبہ میں فرماتے ہیں۔

وَقَالَ الشَّافِعِیُّ يُقْبَلُ اِذَا اعْتُضِدَ بِمَجِيْئِهٖ مِنْ وَجْهٍ آخَرَ يُبَايِنُ

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں مرسل قابل قبول ہے جبکہ طریق اول کے علاوہ

الطریق الاولیٰ مُسنداً کان او مُرسلاً۔ (شرح نخبۃ الفکر ص ۵۱)

کسی دوسرے طریق سے اسے مضبوط کر دیا جائے دوسری روایت چاہے مرسل ہو یا مسند۔

چوتھا اور پانچواں اثر بھی مرسل ہے کیونکہ عبدالعزیز ابن رفیع نے ابی ابن کعب رضؓ کو یحییٰ ابن سعید انصاری نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو نہیں پایا لیکن یہ دونوں اثر یزید ابن رومان کے اثر کے مؤید ہونے کی وجہ سے مقبول ہیں۔ بہرحال ان پانچوں روایات سے ثابت ہو گیا کہ عہد فاروقی میں خود حضرت فاروق اعظم رضؓ کے حکم سے بیس رکعت تراویح کا عمل جاری ہوا۔ اور اس وقت سے امت پر ہمیشہ کے لئے لازم ہو گیا۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔

عَلَیْکُمْ بِسُنَّتِی وَسُنَّۃِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِیْنَ الْمَھْدِیِّیْنَ عَضُّوْا عَلَیْھَا بِالنَّوَاجِذِ (رواہ الترمذی وقال ھذا حدیث حسن صحیح) (ترمذی شریف ص ۹۲ ج ۲)

میری اور میرے ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سنت لازم پکڑو اور انہیں اپنے دانتوں سے مضبوطی کے ساتھ دبا لو۔

شراح حدیث لکھتے ہیں۔

فَاِنَّ لفظ علیکم یَدُلُّ عَلَی اللُّزُوْمِ وَضْعًا وَالْمَعْطُوْفُ فِیْ حُکْمِ المعطوفِ عَلَیْہِ لغۃً فَثَبَتَ بِہٖ لُزُوْمُ سنۃِ الْخُلَفَاءِ کَلُزُوْمِ سُنَّۃِ الرَّسولِ صلّی اللہ علیہ وسلّم (اعلاء السنن ص ۷۰ ج ۷)

بے شک لفظ "علیکم" باعتبار وضع لزوم پر دلالت کرتا ہے اور معطوف باعتبار لغت معطوف علیہ کے حکم میں ہوتا ہے تو حدیث سے ثابت ہوا کہ خلفائے راشدین کی سنت بھی لازم ہے جسطرح خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت لازم ہے۔

چنانچہ اسی وقت تمام امت کا اس پر اجماع ہوگیا۔

علامہ نوویؒ فرماتے ہیں۔

ثُمَّ اَسْتَقَرَّ الْاَمْرُ عَلٰی عِشْرِیْنَ فَاِنَّہ المتوارثُ۔ (مرقاۃ ص ۱۹۴ ج ۳)

پھر بیس پر عمل قرار پاگیا اور وہی سلف سے خلف تک چلا آرہا ہے۔

ابن حجرؒ کی فرماتے ہیں۔

اَجْمَعَ الصحابۃُ عَلٰی اَنَّ التراویحَ عِشْرُوْنَ رکعۃً (مرقاۃ ص ۱۹۴ ج ۳)

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا اجماع ہے کہ تراویح بیس رکعات ہیں۔

مسئلۂ تراویح پر تحقیقی نظر

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے تراویح کی بیس رکعات کا تعین اگرچہ روایات صحیحہ میں صراحتہً وارد نہیں ہوا ہے۔ لیکن روایات صحیحہ سے بدرجۂ تواتر یہ ثابت ہوکر کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادات خصوصًا نمازیں رمضان المبارک کے ایام میں دیگر ایام کی بنسبت نمایاں طور پر بڑھ جاتی تھیں۔

صحیح مسلم کی روایت ہے۔

قالتْ عائشۃُ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہ علیہ وسلَّمَ یَجْتَھِدُ فی العَشْرِ الاَوَاخِرِ مَالَا یَجْتَھِدُ فِیْ غَیْرِہٖ (صحیح مسلم ص ۳۷۲ ج ۱)

حضرت عائشہ رضؓ نے فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رمضان المبارک کے آخری عشرے میں دیگر ایام کی بنسبت زیادہ عبادت کے سلسلہ میں جد وجہد فرماتے تھے۔

صحیحین کی روایت ہے۔

عَنْ عائشۃَ قالتْ کانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلّٰی علیہ وسلَّمَ اِذَا دَخَلَ العَشْرُ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب آخری عشرہ آجاتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

اَحْیٰی اللَّیْلَ وَاَیْقَظَ اَھْلَہٗ وَجَدَّ وَشَدَّ الْمِئْزَرَ (صحیح البخاری ص ۲۷۱ ج ۱ و صحیح مسلم ص ۳۷۲ ج ۱)

راتوں کو زندہ رکھتے اور اپنے اہل خانہ کو بیدار فرماتے اور عبادت میں کوشش کرتے اور حد درجہ مستعد ہو جاتے تھے۔

انہیں روایات کے پیش نظر نواب صدیق صاحب رح فرماتے ہیں۔

اِنَّ صَلٰوۃَ التَّرَاوِیْحِ سُنَّۃٌ بِاَصْلِھَا لِمَا ثَبَتَ اَنَّہٗ صَلَّی اللّٰہُ علیہ وسلم صَلَّاھَا فِی لَیَالٍ ثُمَّ تَرَکَ شَفَقَۃً عَلَی الْاُمَّۃِ اَنْ لَا تَجِبَ عَلَی الْعَامَّۃِ اَوْ یَحْسِبُوْھَا وَاجِبَۃً وَلَمْ یَاْتِ تَعْیِیْنُ الْعَدَدِ فِی الرِّوَایَاتِ الصَّحِیْحَۃِ الْمَرْفُوْعَۃِ وَلٰکِنْ یُعْلَمُ مِنْ حَدِیْثٍ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یَجْتَھِدُ فِیْ رَمَضَانَ مَا لَا یَجْتَھِدُ فِیْ غَیْرِہٖ رواہ مسلمؒ اَنَّ عَدَدَھَا کَانَ کَثِیْرًا (الانتقاد الرجیح ص ۶۱ بحوالہ رکعات تراویح ص ۹۵)

اصل نماز تراویح سنت ہے اس لئے کہ ثابت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے چند راتوں میں اس کو پڑھا۔ پھر امت پر شفقت کی وجہ سے اس کو چھوڑ دیا کہ کہیں عام لوگوں پر واجب نہ ہو جائے یا لوگ اس کو واجب نہ سمجھ بیٹھیں اور عدد کی تعیین صحیح مرفوع روایتوں میں نہیں آئی ہے۔ لیکن صحیح مسلم کی ایک حدیث ہے "کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں جتنی کوشش اور محنت کرتے تھے وہ اور دنوں سے زیادہ ہوتی تھی" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی تراویح کا عدد زیادہ تھا۔

الحاصل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نمازیں رمضان المبارک میں اور دنوں کی بنسبت یقیناً زیادہ ہوا کرتی تھیں۔ شبہ گذرتا ہے کہ حضرت عائشہ کی وہ حدیث جو صحیح بخاری وغیرہ میں ہے اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نمازیں رمضان المبارک میں غیر رمضان کی طرح گیارہ رکعات سے

زائد نہیں ہوا کرتی تھیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے الفاظ ہیں۔

مَا كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَزِيدُ فِي رَمَضَانَ وَلَا فِي غَيْرِهِ عَلَىٰ إِحْدَىٰ عَشْرَ رَكْعَةً

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رمضان اور غیر رمضان میں گیارہ رکعات سے زیادہ نہیں بڑھاتے تھے۔

(صحیح البخاری ص ۱۵۴ ج ۱)

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ حدیث عائشہ رضؓ تہجد کے سلسلہ میں ہے۔ تہجد اور تراویح کا فرق مدلل طریقہ سے واضح کیا جا چکا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ کے قول سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ حدیث عائشہ باب تہجد میں وارد ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

وَظَهَرَ لِيْ اَنَّ الْحِكْمَةَ فِي عَدَمِ الزِّيَادَةِ عَلَىٰ اِحْدٰى عَشْرَ رَكْعَةً اَنَّ التَّهَجُّدَ وَالْوِتْرَ مُخْتَصٌّ بِصَلٰوةِ اللَّيْلِ

مجھے یہ بات ظاہر ہوئی کہ اگیارہ رکعت پر زیادہ نہ کرنے کی حکمت یہ ہے کہ تہجد اور وتر صلواۃ اللیل کے ساتھ خاص ہیں۔

(فتح الباری ص ۱۴ ج ۳)

وہ احادیث جن سے رمضان المبارک میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نمازوں کی کثرت کا پتہ چلتا ہے اور یہ حدیث جس میں ۱۱ رکعات سے زیادتی کی نفی ہو رہی ہے ان احادیث میں تطبیق دیتے ہوئے حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

پس وجہ تطبیق درمیان ایں روایات کہ صریح دلالت بر زیادتی کیفی و کمی نماز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم در رمضان بر غیر آں میکنند و در آں روایت کی نفی زیادت می کنند ہمیں است کہ آں روایت

پس تطبیق ان صریح روایتوں کے درمیان جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نمازوں میں کمیت اور کیفیت کے اعتبار سے رمضان المبارک میں غیر رمضان کی بنسبت زیادتی پر دلالت کرتی ہیں۔ اور اس روایت کے

محمول بر نماز تہجد است کہ در رمضان و غیر رمضان یکساں بود غالباً بعد دیازدہ رکعت مع الوتری رسد دلیل بریں حمل آنست کہ راوی ایں حدیث ابو سلمہ است در تتمۂ ایں روایت میگوید کہ قالت عائشۃ فقلت یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اتنام قبل ان توتر قال یا عائشۃ اِنّ عَیْنَیَّ تَنَامَانِ ولَا یَنَامُ قَلْبِیْ کذا رواہ البخاری ظاہر است کہ نوم قبل از وتر در نماز تہجد متصور شود نہ در غیر آں۔ وروایات زیادت محمول بر نماز تراویح است کہ در عرف آں زماں بقیام رمضان معبر بود۔

(فتاوی عزیزی ص ۱۸ ج ۱)

درمیان جو زیادتی کی نفی کرتی ہے یہی ہے کہ یہ روایت نماز تہجد پر محمول ہے جو کہ رمضان اور غیر رمضان میں یکساں تھی۔ اس کی تعداد وتر سمیت عموماً گیارہ تک پہونچتی تھی۔ اس بات کہ دلیل یہ ہے کہ روایت کے راوی ابو سلمہ حدیث کے آخر میں کہتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضؓ نے کہا کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا آپ وتر سے پہلے سو جاتے ہیں؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری آنکھیں سو جاتی ہیں میرا دل نہیں سوتا جیسا کہ اسکو بخاری نے بیان کیا۔ ظاہر ہے کہ وتر سے پہلے سونے کا تصور نماز تہجد میں ہے نہ کہ کسی اور نماز میں وہ روایات جن سے زیادتی کا پتہ چلتا ہے وہ نماز تراویح پر محمول ہیں۔ جسے اسوقت قیام رمضان کہا جاتا تھا۔

ان مباحث کا خلاصہ یہی ہے کہ ان تین راتوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تراویح پڑھائی اس کی کوئی معین تعداد روایات صحیحہ مرفوعہ سے ثابت نہیں ہوتی لیکن یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تعداد زیادہ تھی۔

شاہ عبدالعزیز صاحبؒ فرماتے ہیں۔

آمدیم برآں کہ قیام رمضان بچند رکعت ادا

ہم اس نتیجہ پر آئے کہ قیام رمضان آپ نے

میفرمودند در روایات صحیحہ مرفوعہ تعیین عدد نیامدہ لیکن از الفاظ مذکورہ در جدو اجتہاد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم معلوم شود کہ عددش بسیار بود۔
(فتاوی عزیزی ص ۱۱۹ ج ۱)

کتنی رکعات کے ذریعہ فرمایا۔ روایات صحیحہ مرفوعہ میں عدد کی تعیین نہیں آئی ہے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محنت اور کوشش کے سلسلہ میں آئے ہوئے الفاظ سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی تعداد زیادہ تھی۔

۱۔ الحاصل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام رمضان رکعات کی کثرت کے ساتھ تھا
۲۔ کثرت کی تعیین روایات صحیحہ سے نہیں ہو سکی۔

یہاں یہ بات حل طلب ہے کہ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیس رکعات کی تعیین اور تحدید کس بنیاد پر فرمائی۔ اور تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے بھی عملاً بیس ہی پر اجماع کر لیا؟ اس خدشہ کا واضح حل یہی ہے کہ جس طرح صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اپنی زبان سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال مبارکہ نقل کرتے ہیں اور وہ دلائل شرعیہ ہوتے ہیں اسی طرح وہ اپنے اعمال وافعال سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم افعال مبارکہ کی نقل ان کی تنفیذ اور اجراء فرماتے ہیں اور وہ بھی دلیل شرعی ہوتا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

اَمَّا رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم فَکَانَ یَتَوَضَّأُ فَیَرَی الصحابۃُ وَضُوْءَہٗ فَیَاْخُذُوْنَ بِہٖ مِنْ غَیْرِ اَنْ یُبَیِّنَ اَنَّ ھٰذَا رُکْنٌ وَذٰلِکَ اَدَبٌ وَکَانَ یُصَلِّیْ فَیَرَوْنَ صَلٰوتَہٗ فَیُصَلُّوْنَ کَمَا

رہا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا عہد مبارک تو آپ وضو فرماتے تھے اور صحابہ رضؓ آپ کے وضو کو دیکھکر اس پر عمل کرتے تھے بغیر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریح کے کہ یہ رکن ہے وہ مستحب ہے۔ اور آپ نماز پڑھتے تھے پس صحابہ رضؓ جس

رَأَوْهُ يُصَلِّي وَحَجَّ فَرَمَقَ النَّاسُ حَجَّتَهُ فَفَعَلُوْا كَمَا فَعَلَهُ،
(حجۃ اللہ البالغہ ص ۳۳۰ ج ۱)

طرح آپ کو نماز پڑھتا ہوا دیکھتے تھے اسی طرح خود بھی نماز پڑھتے تھے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کیا پس لوگوں نے بھی دیکھکر ویسے ہی افعال حج ادا کئے جیسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ادا کئے۔

مدینہ کے حضرات چونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور آپ کے اعمال کو دیکھتے اور اس کے مطابق عمل کرنے والے تھے اسی بنیاد امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تعامل اہل مدینہ بھی دلیل شرعی ہے۔

حضرت شاہ صاحب رح فرماتے ہیں۔

وَلِذَالِكَ تَرَىٰ مَالِكًا يُلَازِمُ مُحَجَّتَهُمْ
(حجۃ اللہ البالغہ ص ۳۴۱ ج ۱)

اسی بنا پر امام مالک رح اہل مدینہ کے تعامل کو لازم سمجھتے تھے۔

یہ بات محقق ہے کہ سیدنا فاروق اعظم کے زمانے میں تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا یہ عمل اور اس پر کسی کا بھی اختلاف نہ کرنا یہ اسی قبیل سے ہے یقیناً ان حضرات کی نگاہوں میں اس کے ماخذ اور دلائل رہے ہوں گے۔ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل دیکھا ہوگا۔ اگرچہ بعد والوں کی نگاہوں میں وہ دلائل اس قوت کے ساتھ مستحضر نہیں رہ گئے۔ اس نکتہ کی وضاحت کرتے ہوئے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

بہر حال درین جا قاعدہ کلیہ را ملحوظ نظر باید فرمود کہ در وقت اجماع و اتفاق اہل حل و عقد بر امرے از امور شرعیہ دلائل و ماخذ آں امر از طرق شتیٰ و مسالک متعددہ بر قلوب

بہر حال اس جگہ یہ قاعدہ کلیہ پیش نظر رکھنا چاہئے کہ امور شرعیہ میں سے کسی امر پر اہل حل و عقد کے اجماع کرنے کے وقت اس چیز کے دلائل و ماخذ اس زمانے کے لوگوں کے

اہل عصر واردی شود و بہیت مجموعہ موجب تیقن یا ظن غالب بحکم آں امر میشود اگر از دیگراں کہ دراں وقت حاضر نبودہ اند ہر ہر دلیل را فرادی فرادی نظر کنند نزد ایشان موجب غلبۂ ظن یا تیقن نمی شود لیکن در حق ایشاں اجماع منعقد در زمان سابق در دلیل بودن کفایت می کند۔

(فتاویٰ عزیزی ص ۱۲۰ ج ۱)

دلوں پر وارد ہوتے ہیں اور ہیئت مجموعی اس چیز کے یقین یا ظن غالب کا فائدہ دیتے ہیں اگر وہ لوگ جو اس زمانے میں موجود نہیں تھے ہر ہر دلیل پر الگ الگ غور کریں تو انھیں یقین یا ظن غالب حاصل نہیں ہوگا۔ لیکن ان کے حق میں وہ اجماع جو پہلے ہو چکا ہے دلیل کافی ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیس ۲۰ رکعات تراویح کا صراحۃً ثبوت

جیسا کہ اوپر گذر چکا کہ روایات صحیحہ مرفوعہ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیس ۲۰ رکعات تراویح کا بالتصریح ثبوت نہیں ہے لیکن بعض نسبتہً کم درجہ روایات سے بیس رکعات تراویح کی نسبت خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے صراحۃً ثابت ہے اور ان روایات کو بھی بے اصل نہیں قرار دیا جا سکتا بلکہ وہ فعل صحابہ رضؓ اور اجماع صحابہ رضؓ سے موکد ہونے کی وجہ سے درجۂ استدلال میں قوی ہو جاتی ہیں ان روایتوں میں سے دو کو یہاں ذکر کیا جا رہا ہے۔ پہلی روایت کو ملا علی قاریؒ نے مصنف ابن ابی شیبہ اور دوسری کو بیہقی کی سنن کبریٰ کے حوالے سے مرقاۃ میں نقل کیا ہے۔

(۱) اَنَّہٗ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ کَانَ یُصَلِّیْ بِھِمْ فِیْ رَمَضَانَ عِشْرِیْنَ رَکْعَۃً سِوَی الْوِتْرِ۔

(مرقاۃ ص ۱۹۴ ج ۳)

بے شک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو رمضان المبارک میں وتر کے علاوہ بیس رکعات پڑھاتے تھے۔

(۲) اَنَّہٗ صَلّٰی بِھِمْ عِشْرِیْنَ رَکْعَۃً بِعَشْرِ تَسْلِیْمَاتٍ (مرقاۃ ص ۱۹۴ ج ۳)

بے شک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو بیس رکعات دس سلاموں کے ساتھ پڑھائی۔

ان دونوں روایتوں کو نقل کرکے ملا علی قاری نے ابن حجرؒ کے واسطے سے لکھا ہے۔

لکن الرِّوَایَتَانِ ضعیفتانِ (حوالہ سابقہ)

لیکن یہ دونوں روایتیں ضعیف ہیں۔

بیہقیؒ وغیرہ نے بھی ان کو ضعیف کہا ہے ضعیف کی بنیاد یہ ہے کہ ان دونوں کی اسناد میں ایک راوی ابو شیبہ ابراہیم بن عثمان ہیں اور وہ مجروح راوی ہیں ان روایتوں پر ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ یہ صحیحین میں آئی ہوئی حضرت عائشہؓ کی روایت مَاکَانَ یَزِیْدُ فِی رَمَضَانَ وَلَا فِی غَیْرِہٖ عَلٰی اِحْدٰی وَعِشْرِیْنَ رَکْعَۃً" کی مخالف ہیں دوسرے اعتراض کا تفصیلی جواب گذر چکا ہے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز ان دونوں باتوں کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

در مصنف ابن ابی شیبہ وسنن بیہقی بروایت ابن عباسؓ وارد شدہ کہ کان رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم وعلی آلہ وسلم یُصلی فی رمضان فی غیر جماعۃ بعشرین رکعۃ ویوترا امام بیہقی این روایت را تضعیف نمودہ بآنکہ راوی ایں حدیث جدّ ابوبکر ابن ابی شیبہ است حال آنکہ ابو شیبہ جدّ ابوبکر ابن ابی شیبہ آنقدر

مصنف ابن ابی شیبہ اور سنن بیہقی میں ابن عباسؓ کی روایت سے آیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رمضان المبارک میں بغیر جماعت کے (بھی) بیس رکعات اور وتر پڑھتے تھے۔ لیکن بیہقی نے اس روایت کو ضعیف کہا ہے اس بنیاد پر کہ اس حدیث کے راوی ابوبکر ابن ابی شیبہ کے دادا ہیں حالانکہ ابوبکر ابن ابی شیبہ

ضعف ندارد کہ روایت او را مطروح مطلق ساختہ شود۔ اگر معارض او حدیث صحیح می شد البتہ ساقط می گشت وَقَدْ سَبَقَ اَنَّ مَا یُتَوَهَّمُ مُعَارِضًا لَہٗ اعنی حدیث ابی سلمہ عن عائشہ الْمُتَقَدِّمُ ذِکْرُہٗ لَیْسَ مُعَارِضًا لَہٗ بِالْحَقِیْقَۃِ فَبَقِیَ سَالِمًا۔ کَیْفَ وَقَدْ اَیَّدَ بِفِعْلِ الصَّحَابَۃِ رض

(فتاوی عزیزی ص ۱۲۰-۱۲۱ ج ۱)

کے دادا ابو شیبہ اسقدر ضعیف نہیں ہیں کہ ان کی روایت مطلقاً ترک کردی جائے ہاں اگر حدیث صحیح اس کے مخالف ہوتی تو البتہ ترک کردی جاتی۔ اور یہ بات گذر چکی ہے، جس حدیث کو اس کا معارض سمجھا جاتا ہے یعنی ابو سلمہ عن عائشہ والی حدیث جس کا ذکر گذر چکا تو وہ درحقیقت اس کی معارض نہیں اس لیے یہ حدیث سالم رہی اور ساتھ فعل صحابہ رض سے مؤید بھی ہو گئی۔

ثابت ہوا کہ (۱) یہ حدیث اس قدر ضعیف نہیں ہے کہ ترک کردی جائے۔ (۲) کسی حدیث صحیح کی معارض بھی نہیں ہے (۳) عمل صحابہ کرام رض سے مؤید ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آٹھ رکعت تراویح کی نسبت ثابت نہیں ہے

اوپر مفصلاً گذر چکا ہے کہ حدیث عائشہ رض تہجد کے سلسلہ میں ہے اس لئے اس سے رکعاتِ تراویح ثابت کرنا ع چہ خوش گفت است سعدی در زلیخا کی قبیل سے ہے آٹھ رکعت کے ثبوت میں اس روایت کا بھی تذکرہ کیا جاتا ہے جو صحیح ابن خزیمہ اور صحیح ابن حبان میں ان الفاظ سے مروی ہے۔

عن جابر رض صلّی بنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فِی شَھْرِ رَمَضَانَ ثَمَانِ رکعاتٍ وَاَوْتَرَ (بحوالہ مرقاۃ

حضرت جابر رض فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کے مہینہ میں آٹھ رکعات پڑھائی پھر

ص ۱۹۴ ج ۲ آثار السنن ص ۱۵۱ ج ۱) وتر پڑھایا۔

حضرت جابرؓ سے اس حدیث کے روایت کرنے کے سلسلہ میں عیسیٰ ابن جاریہ منفرد ہیں مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ فرماتے ہیں "ان کا ذکر حافظ ذہبیؒ نے میزان الاعتدال اور حافظ ابن حجرؒ نے تہذیب التہذیب وغیرہ میں کیا ہے اور لکھا ہے کہ امام فن جرح و تعدیل یحییٰ ابن معینؒ نے انکی نسبت لکھا ہے "لیس بذاک" وہ قوی نہیں ہیں اور یہ بھی فرمایا ہے کہ ان کے پاس متعدد منکر روایتیں ہیں اور امام نسائیؒ اور امام ابو داؤدؒ نے کہا ہے وہ منکر الحدیث ہیں اور امام نسائیؒ نے ان کو متروک بھی کہا ہے ساجیؒ اور عقیلیؒ نے ان کو ضعفاء میں ذکر کیا ہے اور ابن عدیؒ نے کہا ہے کہ ان کی حدیثیں محفوظ نہیں ہیں (یعنی شاذ و منکر ہیں)

یہ سات حضرات ہیں جنہوں نے عیسیٰ ابن جاریہ پر جرح کی ہے اور ان کے مقابل میں صرف ایک ابو زرعہ ہیں جنہوں نے "لا باس بہ" (ان میں کوئی مضائقہ نہیں) کہا ہے۔ اور دوسرے ابن حبان ہیں جنہوں نے انکو ثقاۃ میں ذکر کیا ہے اور اصول حدیث کا قاعدہ ہے کہ جرح مفسر تعدیل پر مقدم ہوتی ہے لہذا عیسیٰ اصولاً مجروح قرار پائیں گے بالخصوص جبکہ عیسیٰ پر جو جرحیں کی گئی ہیں وہ بہت سخت ہیں چنانچہ امام نسائی اور ابو داؤد نے ان کو منکر الحدیث لکھا ہے۔ (رکعات تراویح ص ۲۷۔۲۸)

ملا علی قاریؒ اس روایت کو نقل کرکے فرماتے ہیں۔

اجمع الصحابۃ علی ان التراویح	صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کا اجماع ہے تراویح
عشرون رکعۃ (مرقاۃ ص ۱۹۴ ج ۱)	بیس رکعات ہیں۔

صاحب آثار السننؒ نے امام طبرانیؒ کا یہ قول نقل کیا ہے۔

لَا یُرْوٰی عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰہِ اِلَّا	یعنی حضرت جابرؓ سے مجز اس سند کے
بِھٰذَا الْاِسْنَادِ (التعلیق الحسن علی	کسی دوسری سند سے یہ حدیث

آثار السنن ص ۵۱ ج ۱) مروی نہیں ہے۔

ان تمام تحقیقات کا خلاصہ یہ ہے کہ (۱) اس حدیث کے راوی عیسیٰ ابن جاریہ مجروح ہیں (۲) اجماع صحابہ رضؓ اس روایت کی تائید اور تقویت نہیں کرتا (۳) کوئی دوسرا اس کا مؤید اور متابع موجود نہیں ہے ان وجوہات کی بنا پر یہ روایت پایۂ استدلال سے ساقط ہو جاتی ہے۔

بیس ۲۰ رکعت تراویح پر جمہور اُمت کا اجماع

گذشتہ مباحث کی روشنی میں یہ ناقابل انکار حقیقت واضح ہو گئی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور مبارک سے بیس رکعت تراویح پر اجماع ہو گیا ہے۔ جیسا کہ ۱ سائب ابن یزید ۲ یزید ابن رومان ۳ عبد العزیز بن رفیع ۴ یحییٰ ابن سعید کے آثار سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بیس رکعات ہی پڑھتے تھے۔ سائب ابن یزید کے اثر کے آخری الفاظ ہیں۔

وَكَانُوا يَتَوَكَّئُونَ عَلَى عِصِيِّهِمْ فِي عَهْدِ عُثْمَانَ ابْنِ عَفَّانَ رضؓ مِنْ شِدَّةِ الْقِيَامِ (آثار السنن ص ۵۳ ج ۲)	حضرت عثمان ابن عفان رضی اللہ عنہ کے عہد میں لوگ شدت قیام کی وجہ سے اپنے اپنے عصا پر ٹیک لگاتے تھے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی اپنے دو نو پیشروؤں کی طرح بیس رکعات ہی کا حکم فرماتے تھے۔ جیسا کہ اِن آثار سے معلوم ہوتا ہے۔

(۱) وَقَالَ الْبَيْهَقِيُّ فِي سُنَنِهِ وَرُوِّينَا عَنْ شَتِيرِ ابْنِ شَكَلٍ وَكَانَ مِنْ اَصْحَابِ عَلِيٍّ اَنَّهُ كَانَ يَؤُمُّهُمْ فِي رَمَضَانَ بِعِشْرِينَ رَكْعَةً (آثار السنن، ۲۵۵)	شتیر ابن شکل سے مروی ہے (اور یہ حضرت علی رضؓ کے اصحاب میں تھے) کہ وہ لوگوں کو رمضان المبارک میں بیس رکعات پڑھاتے تھے۔

اوران کا پڑھانا حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کے حکم سے تھا۔

(۲) قال ابن ابی شیبۃ فی مصنفہ حدثنا وکیع عن الحسن بن صالح عن عمر بن قیس عن ابی الحسناء ان علیا امر رجلا یصلی بہم فی رمضان عشرین رکعۃ (التعلیق الحسن ص ۵۷ ج ۲)

ابو الحسناء سے مروی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی کو حکم دیا کہ وہ رمضان میں لوگوں کو بیس رکعات پڑھائیں۔

(۳) اخرج البیہقی عن ابی عبد الرحمن السلمی عن علی رضی اللہ عنہ قال ودعا القراء فی رمضان فامر منہم رجلا یصلی بالناس عشرین رکعۃ قال وکان علی یوتر بہم وروی ذالک من وجہ اخر عن علی (آثار السنن ص ۵۶ ج ۱)

عبد الرحمان سلمی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں قراء کو بلوایا اور ان میں سے ایک آدمی کو حکم دیا کہ لوگوں کو بیس رکعات پڑھائے (راوی کہتے ہیں) اور حضرت علی رضی اللہ عنہ لوگوں کو وتر پڑھایا کرتے تھے۔ اور یہ روایت حضرت علی رضؓ سے دوسرے طریق سے بھی مروی ہے۔

روایت بیان کرکے امام بیہقی نے آخر میں یہ صراحت کردی ہے کہ یہ روایت دوسرے طریق سے بھی مروی ہے۔ اسی اثر سے امام ابن تیمیہؒ نے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جاری کردہ تراویح کو بعینہٖ باقی رکھا (منہاج السنۃ ص ۲۲۴ ج ۱) علامہ ابن تیمیہؒ کے اس استدلال پر المنتقی میں حافظ ذہبی نے سکوت کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو المنتقی ص ۵۴۲) جو ان کے نزدیک صحیح ہونے کی دلیل ہے۔

اہل مکہ کا بھی تعامل بیس رکعات پر تھا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں

هٰکَذَا ادرکتُ بَلَدِنَا بِمَکَّةَ یُصَلُّوْنَ عِشْرِیْنَ (تحفۃ الاحوذی ص ۶۷ ج ۲)

میں نے اپنے شہر مکہ میں یوں ہی پایا کہ لوگ بیس رکعات پڑھتے تھے۔

اب رہا عراق (کوفہ بصرہ) تو معلوم ہو چکا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حکم سے بیس پر عمل تھا اور حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ بھی بیس پڑھتے تھے۔

(ملاحظہ ہو تحفۃ الاحوذی ص ۶۷ ج ۲)

تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اس مسئلہ پر اجماع کے سلسلہ میں ابن عبدالبرؒ کا یہ قول ملا علی قاری کے حوالے سے نقل کیا جا چکا کہ۔

اَجْمَعَ الصَّحَابَةُ عَلٰی اَنَّ التَّرَاوِیْحَ عِشْرُوْنَ رَکْعَةً (مرقاۃ ص ۱۹۴ ج ۳)

تمام صحابہ کرام کا اجماع ہے کہ تراویح کی بیس رکعات ہیں۔

ائمہ اربعہ بھی بیس ہی کے قائل ہیں

ائمہ اربعہ میں سے حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ تو مخالف موافق سب کو تسلیم ہے کہ وہ بیس ہی کے قائل ہیں امام محمد رحمۃ اللہ کی کتابوں سے لیکر اب تک احناف کی تمام کتابیں اس کی شاہد ہیں امام احمد ابن حنبل رحمۃ اللہ علیہ بھی بیس کے قائل ہیں۔ فقہ حنبلی کی کتاب المقنع میں ہے۔

ثُمَّ التَّرَاوِیْحُ وَھِیَ عِشْرُوْنَ رَکْعَةً یَقُوْمُ بِھَا فِیْ رَمَضَانَ فِیْ جَمَاعَةٍ

پھر تراویح اور یہ بیس رکعات ہے جسے رمضان میں جماعت کے ساتھ پڑھے۔

(المقنع ص ۱۸۳ ج ۱)

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ بھی بیس ہی رکعات پسند فرماتے ہیں۔ ان کا قول ہے۔

وَاَحَبُّ اِلَیَّ عِشْرُوْنَ رَکْعَةً (قیام اللیل ص ۹۲ بحوالہ رکعات تراویح ص ۹)

مجھے بیس ہی رکعات تراویح پسند ہیں۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ایک قول بیس ہی رکعات کا ہے۔ ابن رشد مالکیؒ بدایۃ المجتہد میں فرماتے ہیں۔

فَاخْتَارَ مَالِكٌ فِي اَحَدِ قَوْلَيْهِ وَاَبُوْ حَنِيْفَةَ وَالشَّافِعِيُّ وَاَحْمَدُ وَدَاوُدُ الْقِيَامَ بِعِشْرِيْنَ رَكْعَةً سِوَى الْوِتْرِ (بدایۃ المجتہد ص ۱۹۲)

امام مالکؒ نے اپنے ایک قول کے اعتبار سے اور امام ابوحنیفہؒ امام شافعی امام احمد بن حنبلؒ اور داؤدؒ نے وتر کے علاوہ بیس رکعات کو اختیار کیا ہے۔

چھتیس ۳۶۔ چالیس ۴۰ اور اٹھائیس ۴۸ رکعات کی توجیہ

اور جو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول مشہور ہے کہ ان نزدیک تراویح کی چھتیس رکعتیں ہیں جیسا کہ صاحب بدایۃ المجتہد نقل کرتے ہیں۔

وَذَكَرَ ابْنُ الْقَاسِمِ عَنْ مَالِكٍ اَنَّهُ كَانَ يَسْتَحْسِنُ سِتًّا وَثَلَاثِيْنَ رَكْعَةً وَالْوِتْرَ ثَلَاثَ رَكْعَاتٍ (بدایۃ المجتہد ص ۱۹۲)

ابن القاسم نے امام مالکؒ سے نقل کیا ہے کہ چھتیس رکعات تراویح پسند کرتے تھے اور وتر تین رکعات۔

اسی طرح بعض سے چالیس اور بعض سے اٹھائیس رکعات منقول ہیں۔

ان سب کی توجیہ محققین نے یہ کی ہے کہ اہل مکہ ہر ترویحہ کے بعد سات طواف کیا کرتے تھے اور طواف کے بعد دو رکعت صلواۃ طواف پڑھتے تھے اور آخر میں طواف نہ کر کے دعا مانگتے تھے اس طرح یہ آٹھ رکعات زیادہ ہوگئیں اور مجازاً ان کو بھی تراویح میں شامل کر لیا گیا اس طرح تعداد اٹھائیس ہوگئی۔ اہل مدینہ نے چاہا کہ کثرتِ ثواب میں اہل مکہ کی ہمسری حاصل کریں چونکہ وہاں طواف کی شکل تھی نہیں تو اس کے بدلہ میں ہر ترویحہ کے بعد چار رکعات کا اضافہ کر دیا اسی طرح یہ مزید سولہ رکعات بھی مجازاً تراویح میں شمار کی جانے لگیں اس طرح رکعات چھتیس ہوگئیں اور

بعض حضرات پانچویں ترویحہ کے بعد بھی چار رکعت مزید پڑھتے تھے اس بنا پر کل رکعات چالیس ہوگئیں۔ مُلّا علی قاریؒ علامہ سیوطیؒ سے نقل کرتے ہیں۔

وَذَكَرَ السُّيُوطِي فِي رِسَالَتِهِ أَنَّ يُنْتَدَبَ لِأَهْلِ الْمَدِينَةِ سِتًّا وَثَلَاثِينَ رَكْعَةً تَشْبِيهًا بِأَهْلِ مَكَّةَ حَيْثُ كَانُوا يَطُوفُونَ بَيْنَ كُلِّ تَرْوِيحَتَيْنِ طَوَافًا وَيُصَلُّونَ رَكْعَتَيْهِ وَلَا يَطُوفُونَ بَعْدَ الْخَامِسَةِ فَأَرَادَ أَهْلُ الْمَدِينَةِ مُسَاوَاتَهُمْ فَجَعَلُوا مَكَانَ كُلِّ طَوَافٍ أَرْبَعَ رَكَعَاتٍ (مرقاۃ ص ۱۹۳ ج ۳)

علامہ سیوطیؒ نے اپنے رسالہ میں ذکر کیا ہے کہ اہل مدینہ کے لئے چھتیس رکعات بہتر ہیں اہل مکہ کے ساتھ مشابہت اختیار کرتے ہوئے اس لئے کہ وہ لوگ ہر دو ترویحہ کے درمیان طواف کرتے اور طواف کی دو رکعت پڑھتے تھے۔ اور پانچویں کے بعد طواف نہیں کرتے تھے۔ تو اہل مدینہ نے ثواب میں ان کی برابری کا قصد کیا اور طواف کے بدلہ چار رکعت پڑھنے لگے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے بھی اپنے فتاویٰ میں یہی توجیہ بیان فرمائی ہے۔ (ملاحظہ ہو فتاویٰ عزیزی ص ۱۲۰ ج ۱)

اور جو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے گیارہ رکعات کا قول نقل کیا جاتا ہے امام مالکؒ کی طرف اسکی نسبت ثابت نہیں ہے مذہب مالکیہ کی مستند اور مشہور کتب مثلاً "مدونہ کبریٰ" "بدایۃ المجتہد" وغیرہ میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ ان تمام مباحث سے یہ ثابت ہوگیا کہ (۱) بیس رکعات کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک بے اصل نہیں ہے۔ (۲) خلفائے ثلاثہ رضؓ صحابہ کرام رضؓ ائمہ مجتہدین سب کا بیس پر اجماع ہے (۳) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آٹھ کی نسبت بے اصل ہے اس لئے آٹھ رکعات تراویح کا دعویٰ کرنا سنت رسول اللہ علیہ علیہ وسلم سنتِ خلفائے راشدین اور اجماع کی مخالف اور دلائل شرعیہ کو پامال کرنا ہے۔ اللھم احفظنا منہ

مسئلہ تراویح پر ایک اصولی گفتگو

مشہور حدیث شریف

مَنْ قَامَ رَمَضَانَ اِیْمَانًا وَّاِحْتِسَابًا غُفِرَلَهٗ مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ (متفق علیہ مشکوٰۃ ص ۱۷۳ ج ۱)

جس نے رمضان المبارک میں ایمان اور احتساب کے ساتھ نمازیں ادا کیں تو اسکے تمام گذشتہ گناہ معاف کردیئے جائیں گے

اور اس سے قبل جو حدیثیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نمازوں کی کثرت کے سلسلہ میں بیان کی گئیں۔ ان سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ رمضان المبارک میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نمازیں بہت زیادہ ہوا کرتی تھیں جیسا کہ غیر مقلدین کے متفق علیہ عالم نواب صدیق صاحبؒ نے بھی اسکو تسلیم کیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آٹھ رکعات تراویح کے سلسلہ میں جو حضرت جابرؓ کی روایت پیش کی جاتی ہے۔ اگر وہ ثابت بھی ہو جائے تو زیادہ سے زیادہ وہ ایک رات کا واقعہ ہے جیسا کہ خود حدیث کے لفظ "صلی بنا" سے اسکی صراحت ہوتی ہے جبکہ یہ بات محقق ہے کہ تراویح باجماعت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کم از کم تین دن یقیناً پڑھائی ہے اس کے برخلاف بیس رکعت پڑھانے کے سلسلہ میں مصنف ابن ابی شیبہ کے حوالے سے جو روایت نقل کی گئی ہے اس کے الفاظ ہیں "کان یصلی بنا" ان الفاظ سے صراحت ہوتی ہے کہ یہ عمل کم از کم صرف ایک دن کا نہیں تھا بلکہ کئی دن ہوا۔ الحاصل رمضان المبارک میں عبادت کے سلسلہ میں آئی ہوئی صحیح اور متواتر احادیث نمازوں کی کثرت کی شہادت دیتی ہیں۔ اور آٹھ رکعت والی حدیث سے یہ معاملہ صرف ایک رات کا ثابت ہوتا ہے جبکہ بیس رکعات والی حدیث اس کثرت صلوٰۃ کی تائید کے ساتھ ساتھ اس کے تسلسل پر دلالت کرتی ہے پھر مزید برآں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے باقاعدہ اجراء

کی وجہ سے وہ سنت خلفاء میں بھی داخل ہوگئی ہے، جو اہل سنت والجماعت کے نزدیک ایک مستقل دلیل شرعی ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین الخ میں "سنۃ الخلفاء" کا "سنتی" پر عطف ہے اور قواعدہ نحویہ کی رو سے اصل عطف میں مغایرت ہے کہ معطوف، معطوف علیہ کا غیر ہونا چاہئے۔ (ملاحظہ ہو مکتوب حضرت نانوتوی مندرجہ لطائف قاسمی ص ۱۰ و مکتوب حضرت گنگوہیؒ ص ۱۵)

تو ثابت ہوا کہ جسطرح سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم دلیل اور واجب العمل ہے۔ اسی طرح سے سنت خلفاء بھی مستقلاً دلیل اور واجب العمل ہے غیر مقلد حضرات کو اگر سنۃ خلفاء کا دلیل ہونا تسلیم نہیں ہے تو انہیں اپنے محقق اور مقتدا عالم نواب صدیق حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اس تحقیق کو تو تسلیم کرنا چاہئے۔ نواب صاحبؒ فرماتے ہیں

اِنَّ مَا سَنَّهُ الْخُلَفَاءُ الرَّاشِدُوْنَ مِنْ بَعْدِهٖ فَالْاَخْذُ بِهٖ لَيْسَ اِلَّا لِاَمْرِهٖ صلی اللہ علیہ وسلم بِالْاَخْذِ بِهٖ وَالْاِقْتِدَاءِ بِمَا فَعَلُوْهُ هُوَ لِاَمْرِهٖ صلی اللہ علیہ وسلم لَنَا بِالْعَمَلِ بِسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ (الدین الخالص ص ۳۵۴ ج ۲ بحوالہ الکلام المفید ص ۸۷)	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو امور حضرات خلفائے راشدین نے جاری کیے ہیں ان کی ان امور میں پیروی اور اقتداء صرف اس لئے ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی ہمیں خلفائے راشدین کی سنت کی پیروی کا حکم دیا۔

نواب صاحبؒ تسلیم کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفائے راشدین جو سنت جاری کریں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اختیار کرنے کا حکم دیا ہے تو تراویح کے سلسلہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو سنت جاری فرمائی اسے اختیار کرنا چاہئے بالخصوص جبکہ جمہور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا تعامل اور اجماع بھی اسی کی موافقت کرتا ہے۔

مسئلہ طلاق ثلثہ

مسئلہ تراویح کے بعد دوسرا اہم مسئلہ جس میں غیر مقلدین جمہور اہل سنت والجماعت سے اختلاف کرتے ہیں وہ ایک مجلس کی تین طلاقوں کا مسئلہ ہے۔ شریعت نے طلاق دینے کا بہتر طریقہ یہ بتلایا ہے کہ شوہر اپنی بیوی کو ایک طلاق ایسے طہر میں دے جس میں اس نے بیوی سے مباشرت نہ کی ہو۔ پھر عدت گذر جانے کے بعد عورت جدا ہو جائے گی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔

فَإِنْ أَرَادَ أَنْ يُطَلِّقَهَا فَلْيُطَلِّقْهَا حِينَ تَطْهُرُ مِنْ قَبْلِ أَنْ يُجَامِعَهَا (مسلم شریف ص ۴۷۶ ج ۱)

پھر اگر طلاق دینے کا ارادہ کرے تو اسے طلاق طہر کی حالت میں دے جبکہ اس سے مباشرت نہ کی ہو۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو اگر طلاق کی ضرورت پیش آتی تو ان کا عمومی اور پسندیدہ عمل یہی تھا۔

رُوِيَ عَنْ إِبْرَاهِيمَ النَّخَعِيِّ رَحِمَهُ اللهُ عَلَيْهِ أَنَّهُ قَالَ كَانَ أَصْحَابُ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَسْتَحْسِنُونَ أَنْ لَا يُطَلِّقُوا لِلسُّنَّةِ إِلَّا وَاحِدَةً ثُمَّ لَا يُطَلِّقُونَ ذَالِكَ حَتّٰى تَنْقَضِيَ الْعِدَّةُ (اخرجہ ابن ابی شیبۃ فی مصنفہ)

ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم پسند کرتے تھے کہ بطور سنت ایک ہی طلاق دی جائے۔ پھر اس کے بعد کوئی طلاق نہ دیں یہاں تک کہ عدت گذر جائے۔

اگر کوئی شخص مکمل تین ہی طلاق دینا چاہتا ہے تو اس کی بہتر شکل یہ ہے کہ تینوں طلاقوں کو تین طہروں میں مکمل کرے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

اَنْ تَسْتَقْبِلَ الطُّهْرَ اِسْتِقْبَالًا فَتُطَلِّقَهَا لِكُلِّ طُهْرٍ تطليقة

تم طہر کا بطور خاص انتظار کرو پھر ہر طہر میں ایک طلاق دو۔

(بدائع ص ۸۹ ج ۳ وروی مثلہ الدار قطنی والطبرانی کما فی الدرایہ ص ۳۵۵ ج ۲ علی ھامش الھدایۃ۔

لیکن اگر کوئی شخص طریقۂ سنت کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ایک ہی مجلس میں تینوں طلاقیں دے ڈالے تو باوجود یہ اس کا یہ عمل شریعت کی نگاہ میں ناپسندیدہ اور قابل مواخذہ ہے پھر بھی یہ تینوں طلاقیں واقع ہو جائیں گی۔ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

وَاِنْ كُنْتَ طَلَّقْتَهَا ثَلَاثًا فَقَدْ حَرُمَتْ عَلَيْكَ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَكَ وَعَصَيْتَ اللّٰهَ فِيمَا اَمَرَكَ مِنْ طَلَاقِ امْرَاَتِكَ

(صحیح مسلم ص ۴۷۶ ج ۱)

اگر تم نے اپنی عورت کو تین طلاقیں دے دیں تو وہ تم پر حرام ہو جائے گی یہاں تک کہ وہ دوسرے شوہر سے تعلق زوجیت قائم کرے۔ اور تم اپنی بیوی کے طلاق کے سلسلہ میں اللہ کے حکم کی نافرمانی کرو گے۔

بالکل ظاہر ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ قول مجلس واحد کی تین طلاقوں کے سلسلہ میں ہے کیونکہ اگر تین طلاقیں تین طہر میں دی جائیں تو اسکی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت عنایت فرمائی ہے جیسا کہ دار قطنی طبرانی وغیرہ کے حوالہ سے حدیث گذر چکی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے باوجود حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا اُسے معصیت قرار دینا امر محال ہے۔ اس لئے یہ بات بالکل طے ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے معصیت ہونے کے باوجود جن کے نافذ ہونے کا مسئلہ بیان فرمایا ہے وہ مجلس واحد ہی کی تین طلاقیں ہیں۔

جمہور صحابہ کرام۔ تابعین عظام اور ائمہ مجتہدین کا یہی مسلک ہے۔ محقق

ابن الہمام المتوفی ۸۶۱ھ فرماتے ہیں۔

وَذَهَبَ جُمْهُوْرُ الصحابةِ وَالتَّابِعِيْنَ وَمَنْ بَعْدَهُمْ مِنْ اَئِمَّةِ الْمُسْلِمِيْنَ اِلٰى اَنَّهٗ يَقَعُ الثَّلَاثُ

جمہور صحابہ کرام رض تابعین اور ان کے بعد کے ائمہ مسلمین کا یہی مذہب ہے کہ تینوں طلاقیں واقع ہو جائیں گی۔

(فتح القدیر ص ۳۳۰ ج ۳)

شارح مسلم علامہ نووی رح المتوفی ۶۷۶ھ فرماتے ہیں۔

فَقَالَ الشَّافِعِيُّ وَمَالِكٌ وَاَبُوْحَنِيْفَةَ وَاَحْمَدُ وَجَمَاهِيْرُ مِنَ السَّلَفِ وَالْخَلَفِ يَقَعُ الثَّلَاثُ۔

تو امام شافعی رح امام مالک رح امام ابوحنیفہ اور امام احمد بن حنبل رح اور تمام متقدمین اور متاخرین کا قول ہے کہ تینوں طلاقیں واقع ہو جائیں گی۔

علامہ بدرالدین العینی شارح بخاری المتوفی ۸۵۵ھ فرماتے ہیں۔

وَمَذْهَبُ جَمَاهِيْرِ الْعُلَمَاءِ مِنَ التَّابِعِيْنَ وَمَنْ بَعْدَهُمْ مِنْهُمُ الْاَوْزَاعِيُّ وَالنَّخَعِيُّ وَالثَّوْرِيُّ وَاَبُوْحَنِيْفَةَ وَاَصْحَابُهٗ وَمَالِكٌ وَاَصْحَابُهٗ وَالشَّافِعِيُّ وَاَصْحَابُهٗ وَاَحْمَدُ وَاَصْحَابُهٗ وَاِسْحَاقُ وَاَبُوْثَوْرٍ وَاَبُوْعُبَيْدٍ وَاٰخَرُوْنَ كَثِيْرُوْنَ عَلٰى مَنْ طَلَّقَ اِمْرَاَتَهٗ ثَلَاثًا وَقَعْنَ وَلٰكِنَّهٗ يَاْثَمُ وَقَالُوْا مَنْ خَالَفَ فِيْهِ فَهُوَ شَاذٌّ مُخَالِفٌ لِاَهْلِ السُّنَّةِ

تابعین اور ان کے بعد کے تمام علماء جن میں امام اوزاعی امام نخعی امام ثوری امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب امام مالک اور ان کے اصحاب امام شافعی اور ان کے اصحاب امام احمد اور ان کے اصحاب امام اسحاق امام ابوثور امام ابوعبید اور ان کے علاوہ بہت سارے ائمہ رحمہم اللہ کا مذہب یہی ہے کہ جس شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں تو سب واقع ہو جائیں گی۔ البتہ وہ شخص

وَاِنَّمَا تَعَلَّقَ بِهٖ اَھْلُ الْبِدَعِ وَمَنْ لَا یُلْتَفَتُ اِلَیْہِ لِشُذُوْذِہٖ مِنَ الْجَمَاعَۃِ (عمدۃ القاری ص ۲۷ ۵ ج ۹)

گناہ گار ہوگا اور جمہور کہتے ہیں جو شخص اس سلسلہ میں اختلاف کرتا ہے تو وہ متفرد اور اہل سنت والجماعت کا مخالف ہے اور اس مخالفت سے تو اہل بدعت اور وہ لوگ وابستہ ہیں جو جماعت مسلمین سے منحرف ہونے کی وجہ سے ناقابل التفات ہیں۔

محقق ابن الہمام رح علامہ نووی رح۔ علامہ عینی رح کے علاوہ بے شمار علمائے کرام نے جمہور امت کے اس مسئلہ پر اجماع اور اتفاق کی صراحت کی ہے۔ بغرض اختصار صرف انہیں تین حضرات کی عبارتوں پر اکتفاء کیا گیا ہے۔ اس اجماع اور اتفاق کے برخلاف متقدمین میں سے دو ایک اور متاخرین میں علامہ ابن تیمیہ رح المتوفی ۷۲۸ھ اور ان کے شاگرد علامہ ابن القیم رح المتوفی ۷۵۱ھ اور موجودہ دور میں غیر مقلدین کا کہنا ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں ایک ہی ہوں گی اب ہم اختصار کے ساتھ طرفین کے کچھ دلائل بیان کرتے ہیں تاکہ مسائل دینیہ کو دلائل کی روشنی میں سمجھنے والوں کے لئے شرح صدر اور اطمینان کلی کا سامان فراہم ہو۔

جمہور امت کے دلائل

پہلی دلیل۔ اس مسئلہ کی سب سے بنیادی دلیل قرآن کریم کی "آیت طلاق" الطلاق مرتان الخ (البقرہ) ہے۔ کتب تفسیر میں آیت مذکورہ کے دو شانِ نزول بیان کئے گئے ہیں۔ ایک شانِ نزول وہ ہے جو بیہقی رح اور ابن مردویہ رح نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ میں نقل کیا ہے۔

عَنْ عَائِشَۃَ قَالَتْ لَمْ یَکُنْ لِلطَّلَاقِ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں۔

وَقْتٌ يُطَلِّقُ الرَّجُلُ امْرَأَتَهُ ثُمَّ يُرَاجِعُهَا مَالَمْ تَنْقَضِ الْعِدَّةُ فَوُقِّتَ لَهُمُ الطَّلَاقُ ثَلَاثًا يُرَاجِعُهَا فِي الْوَاحِدَةِ وَالثِّنْتَيْنِ وَلَيْسَ فِي الثَّالِثَةِ رَجْعَةٌ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ۔

(تفسیر ابن کثیر ص ۲۷۷ ج ۱)

پہلے طلاق کی کوئی تحدید نہیں تھی۔ آدمی اپنی بیوی کو طلاق دیتا رہتا تھا اور عدت گذرنے سے قبل رجوع کر لیا کرتا تھا۔ تو ان کے لئے تین طلاقیں متعین کر دی گئیں۔ ایک اور دو طلاق میں تو شوہر اپنی بیوی سے رجعت کر سکتا ہے اور تیسری طلاق کے بعد رجعت نہیں ہے یہانتک وہ دوسرے شوہر سے نکاح کرے۔

امام طبریؒ اپنی تفسیر میں اسی شان نزول کی روشنی میں لکھتے ہیں

فَتَاوِيلُ الْآيَةِ عَلٰى هٰذَا الْخَبَرِ الَّذِي ذَكَرْنَا عَدَدُ الطَّلَاقِ الَّذِي لَكُمْ اَيُّهَا النَّاسُ فِيهِ عَلٰى اَزْوَاجِكُمُ الرَّجْعَةُ اِذْ كُنَّ مَدْخُولًا بِهِنَّ تَطْلِيقَتَانِ ثُمَّ الْوَاجِبُ بَعْدَ التَّطْلِيقَتَيْنِ اِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ اَوْ تَسْرِيحٌ بِاِحْسَانٍ لِاَنَّهُ لَا رَجْعَةَ لَهُ بَعْدَ التَّطْلِيقَتَيْنِ اِنْ سَرَّحَهَا فَطَلَّقَهَا الثَّلَاثَةَ

(تفسیر طبری ص ۲۵۸ ج ۳)

تو آیت کی تفسیر اس شان نزول کے اعتبار سے جس کو ہم نے ذکر کیا یہ ہے کہ اس طلاق کی تعداد جس میں تمہیں اے مردو اپنی مطلقہ بیویوں پر رجعت کا حق ہے۔ جبکہ ان سے ہم بستری ہو چکی ہو۔ دو طلاقیں ہیں۔ ان دو طلاقوں کے بعد خوش اسلوبی کے ساتھ نکاح میں روک لینا ہے یا حسن سلوک کے ساتھ چھوڑ دینا ہے اس لئے کہ دو طلاقوں کے بعد اگر چھوڑنا چاہے اور تیسری طلاق دیدے تو پھر رجعت نہیں ہے۔

مطلب یہ ہے کہ شوہر اپنی بیویوں کو جتنی چاہتے طلاقیں دیدیتے تھے اور عدت گذرنے سے پہلے رجعت کر لیا کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے آیت کریمہ کے ذریعہ طریقۂ جاہلیت کو ختم کر کے طلاق اور رجعت کے حدود متعین فرما دیئے کہ طلاق

کی تعداد صرف تین تک ہے اور رجعت فقط دو طلاقوں تک ممکن ہے آیت کریمہ کا دوسرا شان نزول بیان کرتے ہوئے علامہ طبریؒ فرماتے ہیں۔

وَقَالَ الْآخَرُونَ انما نزلت هٰذِهِ الْآيَةُ عَلٰى نَبِيِّ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم تَعْرِيفًا مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى ذِكْرُهٗ عِبَادَهٗ سُنَّةَ طَلَاقِهِمْ نِسَاءَهُمْ إِذَا أَرَادُوا طَلَاقَهُنَّ لَادَلَالَةً عَلَى الْقَدْرِ الَّذِي تَبِيْنُ بِهِ الْمَرْأَةُ مِنْ زَوْجِهَا وَتَأْوِيْلُ الْآيَةِ عَلٰى قَوْلِ هٰؤُلَاءِ سُنَّةُ الطَّلَاقِ الَّتِي سَنَنْتُهَا وَأَبَحْتُهَا لَكُمْ إِنْ أَرَدْتُمْ طَلَاقَ نِسَائِكُمْ أَنْ تُطَلِّقُوْهُنَّ ثِنْتَيْنِ فِي كُلِّ طُهْرٍ وَاحِدَةً ثُمَّ الْوَاجِبُ بَعْدَ ذَالِكَ عَلَيْكُمْ إِمَّا أَنْ تُمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ أَوْ تُسَرِّحُوْهُنَّ بِإِحْسَانٍ

(تفسیر طبری ص ۲۵۹ ج ۳)

دیگر مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ آیت اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ کی طرف اپنے بندوں کو ان کی بیویوں کے طلاق کا پسندیدہ طریقہ سکھلانے کے لئے نازل ہوئی اگر وہ طلاق کا قصد رکھتے ہوں آیت کا مقصد اس مقدار ——— طلاق کو بیان کرنا نہیں ہے جس کے بعد بیوی جدا ہو جاتی ہے ان حضرات کے قول کے اعتبار سے آیت کی تفسیر یہ ہوگی کہ طلاق کا وہ طریقہ جسکو میں نے تمہارے لئے جاری اور مباح کیا یہ ہے کہ جب تم اپنی بیویوں کو طلاق دینی چاہو تو انہیں دو طلاق دو طہروں میں دو پھر تم پر واجب ہے کہ انہیں اچھے طریقہ سے روک لو یا عمدہ طریقہ سے چھوڑ دو۔

الحاصل شان نزول کے اعتبار سے آیت کی دو تفسیریں ہوئیں۔

(۱) آیت میں طلاق کی تعداد اور آخری طلاق کی حد بیان کی گئی ہے۔

(۲) آیت میں طلاق دینے کا شرعی طریقہ تبلایا گیا ہے کہ وہ الگ الگ طہروں میں دی جائیں۔ مجاہد کی یہی رائے ہے امام ابن جریر طبریؒ حافظ ابن کثیرؒ امام رازیؒ وغیرہ نے پہلی ہی تفسیر کو راجح قرار دیا ہے علامہ سید آلوسیؒ نے اسی کو

"الیق بالنظم واوفق بسبب النزول (روح المعانی ص ۱۳۵ ج ۲) نظم آیات اور شان نزول کے مطابق قرار دیا ہے صاحب تفسیر مظہری بھی اسی کے مؤید ہیں۔ (ملاحظہ ہو تفسیر مظہری ص ۳۰۰ ج ۱)۔ پہلی تفسیر کے اعتبار سے "مرتان" کے معنی "شنتان" اور "عددان" ہوں گے یعنی قابل رجعت طلاقیں دو ہیں یہ عام ہے کہ وہ دونوں طلاقیں ۱ ایک ہی مجلس میں ہوں۔

۲ یا الگ الگ طہر میں ہوں۔ دوسری تفسیر کے اعتبار سے "مرتان" کا معنی مرۃً بعد مرۃٍ ہوگا صاحب مدارک التنزیل فرماتے ہیں۔

وَلَمْ يُرِدْ بِالْمَرَّتَيْنِ التَّثْنِيَةَ وَلٰكِنَ التَّكْرِيرَ (مدارک التنزیل ص ۱۱۵ ج ۱) "مرتان" سے تثنیہ نہیں بلکہ تکرار مراد ہے۔

اب اس صورت میں تفسیر یہ ہوگی کہ طلاق کی پسندیدہ شکل یہ ہے کہ وہ الگ الگ طہروں میں دی جائیں قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

وَالْمَعْنٰى اَنَّ التَّطْلِيقَ الشَّرْعِيَّ تَطْلِيقَةٌ بَعْدَ تَطْلِيقَةٍ عَلَى التَّفْرِيقِ فِي الْاَطْهَارِ دُوْنَ الْجَمْعِ (تفسیر مظہری ص ۳۰۰ ج ۱)

معنی یہ ہے کہ شرعی طلاق یکے بعد دیگر الگ الگ طہروں میں طلاق دینا ہے نہ کہ طلاقوں کو جمع کرنا۔

آیت سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کی پسندیدہ طلاق یہی ہے کہ وہ الگ الگ طہروں میں دی جائیں لیکن اس تفسیر کی رو سے بھی آیت سے یہ مطلب اخذ کرنا ہرگز درست نہیں ہے کہ ایک ہی طہر میں اگر طلاقیں جمع کر دی جائیں تو وہ نافذ ہی نہیں ہوں گی۔ ان کے نفس طلاق ہونے سے انکار ثابت کرنا آیت سے کسی بھی طرح ممکن نہیں ہاں انہیں مرضی الٰہی اور طریقہ شریعت کے خلاف کہا جائے گا۔ لیکن حقیقت طلاق کا اطلاق ان پر بھی ہوگا۔

آیت زیر بحث میں "الطلاق مرتان" کے بعد چند طلاق ہی سے متعلق مسائل بیان کر کے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ حَتَّىٰ تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ الخ

اگر شوہر نے تیسری طلاق دیدی تو وہ عورت اس کے لئے حلال نہ ہوگی جبتک کہ دوسرے شوہر سے تعلقِ زوجیت قائم نہ کرلے۔

اس آیت میں تیسری طلاق کا تذکرہ ہے۔ اوپر کی تفصیل سے معلوم ہوا کہ دونوں طلاقیں بیک وقت دیدینا باوجود ناپسندیدہ ہونے کے وقوع سے مانع نہیں ہے بعینہٖ یہی شکل تینوں طلاقیں بیک وقت دیدینے کی ہے کہ وہ بدعت اور باعث گناہ ہونے کے باوجود واقع ہو جاتی ہیں قاضی ثناء اللہ صاحبؒ ان آیات کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

وَعَلَىٰ كِلَا التَّأْوِيلَيْنِ يَظْهَرُ أَنَّ جَمْعَ الطَّلْقَتَيْنِ أَوْ ثَلَاثِ تَطْلِيقَاتٍ بِلَفْظٍ وَاحِدٍ أَوْ بِأَلْفَاظٍ مُخْتَلِفَةٍ فِي طُهْرٍ وَاحِدٍ حَرَامٌ وَبِدْعَةٌ مُؤْثِمٌ خِلَافًا لِلشَّافِعِيِّ فَإِنَّهُ يَقُولُ لَا بَأْسَ بِهِ لَكِنَّهُمْ أَجْمَعُوا عَلَىٰ أَنَّهُ مَنْ قَالَ لِامْرَأَتِهِ أَنْتِ طَالِقٌ ثَلَاثًا يَقَعُ ثَلَاثًا بِالْإِجْمَاعِ

(تفسیر مظہری ص ۳۰۰ ج ۱)

اور آیت کی دونوں تاویلوں کے مطابق یہ بات ظاہر ہے کہ دو یا تین طلاقوں کو جمع کرنا خواہ ایک ہی لفظ سے یا الگ الگ الفاظ سے حرام بدعت اور باعث گناہ ہے امام شافعیؒ اس مسئلہ میں اختلاف فرماتے ہیں ان کے نزدیک جمع کر دینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ لیکن تمام لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ جس شخص نے اپنی بیوی سے یہ کہہ دیا کہ تمہیں تین طلاقیں ہیں تو یہ تینوں بالاجماع واقع ہو جائیں گی۔

علامہ ابن حزم رح فان طلقها فلا تحل له الخ کے تحت لکھتے ہیں۔

فَهٰذَا يَقَعُ عَلَى الثَّلَاثِ مَجْمُوْعَةً وَمُفَرَّقَةً وَلَا يَجُوْزُ اَنْ يَّخُصَّ بِهٰذِهِ الْاٰيَةِ بَعْضَ ذَالِكَ دُوْنَ بَعْضٍ بِغَيْرِ نَصٍّ

یہ آیت ان تین طلاقوں پر بھی صادق آتی ہے جو بیک وقت دی گئی ہوں اور ان طلاقوں پر بھی جو الگ الگ دی گئی ہوں اور بغیر کسی نص کے آیت کو کسی ایک ہی شکل کے ساتھ خاص کرنا درست نہیں ہے

(المحلی ص ۲۰۷ ج ۱۰)

امام بخاری رحمتہ اللہ علیہ نے بخاری شریف میں باب قائم کیا ہے "باب من اجاز الطلاق الثلث"، علامہ عینی رح علامہ ابن الحجر رح علامہ کرمانی رح علامہ سندھی رح وغیرہ شراح بخاری اس پر متفق ہیں کہ امام بخاری کی مراد یہاں طلاق ثلث سے عام ہے کہ وہ دفعۃً ہوں یا الگ الگ ہوں۔

(ملاحظہ ہو حاشیہ بخاری ۷۹۳ وحاشیہ سندھی ص ۷۹۱ ج ۲)

امام بخاری اپنے اس باب پر قرآن کریم کی مذکورہ آیت سے استدلال کرتے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ امام بخاری رح کے نزدیک بھی آیتِ مذکورہ دونوں شکلوں کو شامل ہے۔

(۲) دوسری دلیل :۔ امام بخاری رحمتہ اللہ علیہ نے اسی باب میں پہلی حدیث حضرت عویمر عجلانی رضی اللہ عنہ کے طلاق اور لعان کے واقعہ کے سلسلہ میں بیان کی ہے کہ انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنی بیوی سے لعان کر لینے کے بعد اسی وقت تین طلاقیں دیدیں

حدیث کے الفاظ ہیں۔

فطلقها ثلاثا قبل ان يامره رسول الله صلى الله عليه وسلم

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم دینے سے پہلے ہی انہوں نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیدیں۔

(بخاری شریف ص ۷۹۱ و ۷۹۲ و مسلم شریف ص ۴۸۹ ج ۱)

انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہی تین طلاقیں دیدیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی انکار نہیں فرمایا۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

ولم یُنکر علیہ اطلاق لفظ الثلاث (شرح مسلم ص ۴۸۹ ج ۱)	حضور صلی اللہ علیہ وسلم لفظ تین کے بولنے پر انکار نہیں فرمایا۔

بلکہ ابوداؤد کی روایت میں تو اس بات کی صراحت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تینوں طلاقوں کو نافذ فرمادیا تھا۔ حدیث کے الفاظ ہیں۔

فَطَلَّقَهَا ثَلٰثَ تطليقاتٍ عندَ رسولِ اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم فَاَنْفَذَہٗ رسولُ اللّٰہِ صلّی اللہ علیہ وسلم (ابوداؤد ص ۳۰۷ ج ۱)	انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہی تین طلاقیں دیدیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب کو نافذ فرمادیا۔

اس موقع پر یہ بحث اٹھانا کہ لعان کی وجہ سے فرقت واقع ہوگئی تھی اور وہ عورت محل طلاق ہی نہیں رہ گئی تھی اس لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انکار نہیں فرمایا۔ روایتِ ابوداؤد کی اس صراحت کے بعد بے محل ہے۔

تیسری دلیل:۔

عَنْ مَحْمُودِ بنِ لَبِيدٍ قَالَ اُخْبِرَ رسولُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم عَنْ رجلٍ طَلَّقَ امْرَأَتَهٗ ثَلَاثَ تَطْلِيقَاتٍ جَمِيعًا فَقَامَ غَضْبَانًا ثُمَّ قَالَ اَيُلْعَبُ بِكِتَابِ اللّٰہِ وَاَنَا بَيْنَ اَظْهُرِكُمْ حتّٰی قَامَ رَجُلٌ وَقَالَ	محمود ابن لبید رضؓ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی گئی کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو اکٹھی تین طلاقیں دے دی ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم غصہ سے کھڑے ہوگئے پھر ارشاد فرمایا میرے تمہارے درمیان ہوتے ہوئے اللہ کی کتاب کے ساتھ کھیل

یارسولَ اللّٰہِ اَلَا اَقْتُلُہٗ۔
(نسائی شریف ص ۳۶ ج ۲)

کیا جارہا ہے یہانتک کہ ایک صاحب کھڑے ہوکر کہنے لگے یارسول اللہ کیا میں اسے قتل نہ کردوں۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

ورُوَاتُہٗ مُوثَّقُوْنَ۔
(بلوغ المرام ص ۱۳۵)

اس حدیث کے تمام راوی ثقات میں سے ہیں۔

یہ طلاق دینا یقیناً طریقہ شریعت کے خلاف تھا اس لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم برہم ہوئے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو رد نہیں فرمایا بلکہ نافذ فرمادیا۔ مشہور محدث قاضی ابوبکر ابن العربی فرماتے ہیں۔

فَلَمْ یَرُدَّہُ النَّبِیُّ صلی اللہ علیہ وسلم بَلْ اَمْضَاہُ کما فِی حدیثِ عُوَیْمِرِ العَجْلَانی فِی اللِّعَانِ حیثُ اَمْضٰی طَلَاقَہُ الثَّلٰثَ۔
(تہذیب سنن ابی داؤد ص ۲۹ ج ۳ بحوالہ عمدۃ الاثاث ص ۲۹)

پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تینوں طلاقوں کو رد نہیں کیا بلکہ نافذ کردیا جیسا کہ عویمر عجلانی کی لعان والی حدیث میں بھی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تین طلاقوں کو نافذ فرمادیا تھا۔

چوتھی دلیل:۔

عن ابراھیم عن داؤد بن عبادۃ بن الصامت قال طلق جدّی امرأۃ لہ الف تطلیقۃٍ فانطلق اَبِی الی رسولِ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم فذکر لہٗ ذالِکَ فقال

ابراہیم روایت کرتے ہیں داؤد ابن عبادۃ ابن صامت سے کہ انہوں نے کہا کہ میرے دادا نے اپنی ایک بیوی کو ایک ہزار طلاقیں دیں میرے باپ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ

النبیُّ صلی اللہ علیہ وسلم اَمَا اتَّقَی اللّٰہَ جدُّکَ اَمَا ثلثٌ فَلَہ واَمَّا تسعُ مائۃٍ وسبعۃٌ وتسعونَ فَعُدوَانٌ وظلمٌ اِن شَاءَ اللّٰہُ عذَّبہٗ واِنْ شَاءَ غَفَرَلَہٗ۔	بیان کیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تمہارے والد اللہ سے نہیں ڈرے۔ بہرحال تین طلاق تو ان کا حق تھا۔ رہیں بقیہ نوسو ستانوے طلاقیں تو وہ ظلم و زیادتی ہیں۔ اللہ چاہے تو سزا دیں اور چاہیں تو انہیں معاف کر دیں۔

(مصنف عبدالرزاق ص ۳۹۳ ج ۶)

ظاہر ہے کہ یہ ہزار طلاقیں بیک وقت ہی تھیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں سے تین کو نافذ فرما دیا۔ عہدِ نبوت میں جس کو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیر القرون فرمایا ہے بہت تلاش و جستجو کے بعد بیک مجلس تینوں طلاقیں دینے کی صرف یہی تین مثالیں مل سکیں اور ان تینوں کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نافذ فرما دیا۔ مزید تلاش پر شاید ایک دو مثالیں اور مل جائیں لیکن اتنا مسلم ہے کہ اس پاک معاشرے میں بیک مجلس تینوں طلاقیں دینے کا ان شاذ و نادر واقعات سے قطع نظر کر کے عموماً رواج ہی نہیں تھا۔ صحیح مسلم میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایات سے بھی اس بات کا پتہ چلتا ہے وہ فرماتے ہیں۔

کَانَ الطلاقُ عَلٰی عَھْدِ رسولِ اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم واَبی بکرٍ وسَنَتَیْنِ مِنْ خِلافَۃِ عمر طلاقُ الثلاثِ واحدۃً۔	طلاق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اور حضرت عمر رضؓ کی خلافت کے دو سال تک تین طلاق دینا ایک تھا۔

(صحیح مسلم ص ۴۷۷ ج ۱ و مصنف عبدالرزاق ص ۳۹۲ ج ۶)

یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر کے زمانے میں نیز حضرت عمر کی

خلافت کے ابتدائی ایام تک لوگ تین طلاق دینے کے بجائے صرف ایک ہی طلاق دیتے تھے۔ دوسری حدیث کے الفاظ ہیں۔

فَلَمَّا كَانَ فِي عَهْدِ عُمَرَ تَتَابَعَ النَّاسُ فِي الطَّلَاقِ	جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں لوگ پے در پے طلاق دینے لگے۔

(صحیح مسلم ص ۴۷۷ ج ۱)

ثابت ہوا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور مبارک میں تین طلاقیں بیک وقت دینے کا معاملہ اِکّا دُکّا تھا لیکن سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا زمانہ آتے آتے لوگوں کی کیفیت وہ نہ رہی۔ اب طلاق کے معاملہ میں بے احتیاطیاں عام ہونے لگیں۔ بیک وقت تین طلاقیں دینے کے معاملات بکثرت وقوع پذیر ہونے لگے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مشورے سے ان تینوں طلاقوں کو نافذ کر دیا اور اس پر تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا اجماع ہو گیا۔ اس دور کے تمام اہل اسلام نے کلیتہً اسے تسلیم کر لیا۔ اس کی مخالفت میں کوئی ادنیٰ سی بھی آواز نہیں اُٹھی۔ کیونکہ یہ اجماع کسی نئے مسئلہ کا اجماع نہ تھا کہ بحث و تفحص یا از سرِ نو غور و فکر کی صورت ہوتی۔ بلکہ یہ تو وہ مسئلہ تھا کہ خود زمانہ رسالت میں بھی پیش آچکا تھا اور اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم فیصلہ بھی فرما چکے تھے جیسا کہ عویمر عجلانی رضؓ اور محمود بن لبید رضؓ وغیرہ کی روایت سے ثابت ہے فرق محض اتنا تھا کہ پہلے یہ شکل قلیل الوقوع اور نادر تھی اور اب اس کا وقوع بکثرت ہونے لگا تھا اجماع کا مقصد صرف اتنا تھا کہ آیت کریمہ "الطلاق مرتان" کی دوسری تفسیر "مرۃً بعد مرۃٍ" کی رو سے ہو سکتا ہے کہ کسی کو یہ خیال ہو کہ بیک دفعہ دی گئی طلاقیں شاید واقع نہ ہوں اب اس اجماع کی وجہ سے یہ خلش لوگوں کے ذہنوں سے دور ہو جائے اور مسئلہ کی صحیح صورت فیصلۂ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں از سر نو ذہن نشین ہو جائے۔

امام ابو جعفر احمد بن محمد الطحاوی رح فرماتے ہیں۔

فَخَاطَبَ عُمَرُ رضی اللہ بِذٰلِكَ النَّاسَ جَمِيعًا وَفِيهِمْ اَصْحَابُ رَسُولِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وَرَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمُ الَّذِينَ قَدْ عَلِمُوا مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذٰلِكَ فِي زَمَنِ رَسُولِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فَلَمْ يُنْكِرْهُ عَلَيْهِ مِنْهُمْ وَلَمْ يَدْفَعْهُ دافع

(شرح معانی الآثار ص ۲۹ ج ۲)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سب لوگوں سے اس بارے میں خطاب فرمایا اور ان میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ رض بھی تھے جو بخوبی جانتے تھے کہ اس سے قبل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اس کے متعلق کیا ہوتا رہا؟ لیکن ان میں سے نہ کسی نے اس فیصلہ کا انکار کیا اور نہ کسی نے ٹال مٹول کی۔

مخالفین کے دلائل

وہ حضرات جو ایک مجلس میں دی گئی تین طلاقوں کو ایک ہی مانتے ہیں اپنے نظریہ کی تائید میں جو دلائل پیش کرتے ہیں ان میں سے دو دلیلیں ان کے نزدیک نہایت وقیع ہیں اس موقع پر علی الترتیب وہ دونوں دلیلیں اور ساتھ ساتھ ان کے جوابات بیان کیے جا رہے ہیں تاکہ حقیقت مسئلہ اپنے دلائل کی مضبوطی اور دلائل مخالف کی کمزوری دونوں پہلوؤں سے سامنے آسکے۔

پہلی دلیل:۔ اس سلسلہ میں یہ حضرات اپنی سب سے مضبوط دلیل جس پر انہیں بڑا ناز بھی ہے صحیح مسلم وغیرہ کی اس روایت کو سمجھتے ہیں۔

عن ابن طاؤس عن ابیه عن ابن عباسؓ قال کان الطلاق علی عهد رسول الله صلی الله علیه وسلم وابی بکرؓ وسنتین من خلافة عمرؓ طلاق الثلاث واحدة فقال عمر بن الخطاب ان الناس قد استعجلوا فی امر کانت لهم فیه اناة فلو امضیناه علیهم فامضاه علیهم۔ (صحیح مسلم ص ۷۷۷ ج ۱ و مصنف عبدالرزاق ص ۳۹۲ ج ۱ و مسند امام احمد ص ۲۵۰ ج ۱۱)

ابن طاؤس اپنے باپ طاؤس سے وہ حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ طلاق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اور ابوبکرؓ کے زمانے میں اور عمرؓ کی خلافت کے دو سال تک تین طلاق دینا ایک تھا۔ پس حضرت عمرؓ نے کہا کہ اب لوگوں نے اس کام میں جلدی کی جس میں ان کو ٹھہر ٹھہر کر کرنے کا حکم تھا تو ایسا ہو تا کہ ہم اس کو ان کے اوپر نافذ کر دیتے پس حضرت عمرؓ نے ان کو ان کے اوپر نافذ کر دیا۔

اس حدیث کا مطلب یہ حضرات یہ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور مبارک میں اور عہد صدیقی میں اور خلافت فاروقی کے ابتدائی دو سالوں میں لوگ تین طلاقیں دیا کرتے تھے مگر انہیں ایک ہی قرار دیا جاتا تھا۔ حدیث کا یہ مطلب بیان کرنا سراسر غلط اور الفاظ حدیث پر صحیح غور نہ کرنے کا نتیجہ ہے خود اسی حدیث کے آخری جملے اس کی تکذیب کرتے ہیں حدیث کے الفاظ ہیں۔

قد استعجلوا الخ لوگوں نے اب جلد بازی شروع کر دی ہے گویا پہلے یہ دستور نہ تھا جبکہ یہ حضرات کہتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بھی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ابتدائی زمانے میں یہی دستور تھا جس سے یہ لازم آتا ہے کہ حدیث کی ابتدا اور انتہا میں (معاذ اللہ) تضاد ہے۔ نیز حدیث میں "طلاق الثلاث" کا لفظ ہے یہ صفت موصوف کی نہیں بلکہ اضافت

کی ترکیب ہے جس کا ترجمہ "تین طلاق" کرنا ہرگز درست نہیں بلکہ اس کا صحیح ترجمہ تین طلاقوں کی طلاق یعنی تین طلاق دینے کے بجائے صرف ایک طلاق دیتے تھے۔
(ملاحظہ ہو تحقیق حضرت مولانا حبیب الرحمان محدث اعظمی مطبوعہ المآثر ص ۱۹ شمارہ ۲ ج ۲)

حدیث کا صحیح مطلب یہ ہے کہ اس میں طلاق کی تاریخ بیان کی جارہی ہے کہ عہد نبوی سے لیکر ابتدائے عہد فاروقی تک لوگ یکجا تین طلاقیں دینے کے بجائے ایک ایک طہر میں ایک ایک طلاق دیا کرتے تھے خلافت فاروقی کے تیسرے سال سے لوگوں نے جلد بازی شروع کر دی تو وہ تینوں طلاقیں نافذ کر دی گئیں۔ حدیث میں تغیر مسئلہ نہیں بلکہ لوگوں کی عادت کے تغیر کو تبلایا گیا ہے۔

محقق نووی ؒ فرماتے ہیں۔

المراد ان المعتاد فی الزمن الاول کان طلقۃ واحدۃ وصار الناس فی زمن عمر یوقعون الثلاث دفعۃ فنفذہ فعلی ھذا یکون اخبارا عن اختلاف عادۃ الناس لا عن تغیر حکم فی مسئلۃ واحدۃ۔

مراد یہ ہے کہ پہلے ایک طلاق کا دستور تھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں لوگ تینوں طلاقیں بیک وقت دینے لگے تو حضرت عمر رضؓ نے انہیں نافذ کیا تو اسطور پر یہ حدیث لوگوں کی عادتوں کے بدل جانے کی خبر ہے نہ کہ مسئلہ واحدہ میں حکم کے بدلنے کی اطلاع ہے۔

(نووی شرح مسلم ص ۴۷۸ ج ۱)

محدث ابوزرعہ الرزاق کی تحقیق ہے۔

معنی ھذا الحدیث عندی ان ما تطلقون انتم ثلاثا کانوا یطلقون واحدۃ فی زمن

اس حدیث کا میرے نزدیک یہ مطلب ہے کہ جسے اب تم تین طلاقیں دیا کرتے ہو حضرات صحابہ رضؓ وغیرہ حضور صلی اللہ

النبي صلى الله عليه وسلم وابي بكرٍ وعمرَ رضؓ (سنن کبریٰ ص ۳۳۸ ج ۷)

علیہ وسلم کے زمانہ اور حضرت ابوبکر رضؓ اور حضرت عمر رضؓ کے زمانہ میں صرف ایک ہی دیا کرتے تھے۔

چنانچہ صحیح سند کے ساتھ کوئی ایک واقعہ بھی نہیں پیش کیا جا سکتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یا حضرت ابوبکر رضؓ نے یا حضرت عمر رضؓ نے ابتدائے خلافت میں تین طلاقوں کو ایک قرار دیا ہو۔ اس حدیث کے سلسلہ میں اور بھی تحقیقات محققین نے بیان کی ہیں لیکن غرض اختصار انہیں یہاں بیان نہیں کیا جا رہا ہے مزید تفصیل کے لئے علامہ نووی کی شرح مسلم۔ فتح الباری وغیرہ ملاحظہ ہو۔

دوسری دلیل:۔ مسند احمد کی اس روایت سے پیش کرتے ہیں۔

حدّثنا عبدُ اللهِ حدّثني ابي ثنا سعدُ ابن ابراهيمَ ثنا ابي عن محمدِ بنِ اسحٰقَ حدثني داودُ بنُ الحُصَيْنِ عَنْ عكرمةَ مولى ابنِ عباسٍ عن ابن عباسٍ رضؓ قال طلّقَ ركانةُ بنُ عبدِ يزيدَ اخو بني مطلبٍ امرأتَه ثلاثًا في مجلسٍ واحدٍ فحَزِنَ عليها حُزنًا شديدًا قال فسألَه رسولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم "كيف طلّقتَها؟" قال طلّقتُها ثلاثًا قال فقال "في مجلسٍ واحدٍ" قال

ہم سے حدیث بیان کی عبداللہ نے انہوں نے کہا مجھ سے روایت بیان کی میرے والد نے انہوں نے کہا ہم سے حدیث بیان کی سعد ابن ابراہیم نے انہوں نے کہا ہم سے حدیث بیان کی میرے والد نے محمد ابن اسحٰق سے انہوں نے کہا مجھ سے حدیث بیان کی داؤد ابن حصین نے عکرمہ مولی ابن عباسؓ سے انہوں نے روایت کی ابن عباسؓ سے انہوں نے کہا رکانہ بن عبد یزید مطلبی نے ایک ہی مجلس میں اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیدیں پھر اسکی مفارقت پر انہیں شدید صدمہ ہوا۔ ابن عباسؓ نے کہا پھر ان سے رسول اللہ

نَعَمْ قَالَ" فانما تلك واحدةٌ فارجِعْها ان شئتَ" قال: فَرَجَعها۔ (المحصل من مسند الامام احمد بن حنبل ص ۲۵۰ ج ۱۱)

صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال کیا کہ تم نے اسے کیسے طلاق دی۔ انہوں نے کہا میں نے اسے تین طلاقیں دیدیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک ہی مجلس میں انہوں نے ہاں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ تو فقط ایک ہی ہوئی اگر چاہو تو عورت سے رجوع کرلو۔ ابن عباس کہتے اسپر انہوں نے عورت سے رجوع کرلیا۔

سنن ابوداؤد میں ابن جریج کی روایت ہے کہ ابو رکانہ رضی نے ام رکانہ کو تین طلاق دی تھی اور پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے رجوع کرلیا۔

(ابوداؤد ص ۲۹۸ ج ۱)

یہ حضرات کہتے ہیں اس روایت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مجلس کی تین طلاقوں کے بعد رجوع کرلینے کی اجازت مرحمت فرمائی جو اس بات کا بین ثبوت ہے کہ ان تینوں کو ایک ہی قرار دیا گیا۔

اس استدلال کا جواب دیتے ہوئے علامہ نووی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

وَاَمَّا الروایةُ التی رَوَاهَا المخالفونَ اَنَّ رکانةَ طَلَّقَ ثلاثًا فجَعَلَها واحدةً فروایةٌ ضعیفةٌ عن قومٍ مجهولینَ وانما الصحیحُ ما قَدَّمْنَاهُ اَنَّهُ طَلَّقَهَا اَلْبَتَّةَ ولفظ البتةِ محتملٌ للوحدةِ

رہی وہ روایت جس کو مخالفین نے بیان کیا کہ رکانہ رضی نے تین طلاقیں دی تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ایک قرار دیا تو ضعیف روایت ہے جو مجہول لوگوں سے مروی ہے صحیح تو وہی حدیث ہے جس کو ہم

وللثلاثِ ولَعَلّ صاحبَ هذه الروايةِ الضعيفةِ اِعْتَقَدَ اَنَّ لفظَ البتةَ يقتضي الثلاثَ فَرَوَاهُ با لمعنى الذى فَهِمَهُ وَغَلَطَ فِي ذالك

(نووی شرح مسلم ص ۴۷۸ ج ۲)

نے بیان کیا کہ انہوں نے اپنی عورت کو طلاق البتہ دی تھی اور لفظ البتہ ایک اور تین ہر ایک کا احتمال رکھتا ہے اور شاید اس ضعیف روایت کے راوی نے اس بات کا خیال کیا کہ لفظ البتہ تین طلاقوں کا تقاضہ کرتا ہے اور اپنی سمجھ کے اعتبار سے روایت بیان کرکے اس میں غلطی کی۔

یعنی جس روایت میں حضرت رکانہ رضؓ کے تین طلاق دینے کی صراحت ہے وہ روایت ضعیف ہے بلکہ صحیح روایت یہ ہے کہ انہوں نے طلاق "البتۃ" دی تھی اور لفظ "البتۃ" ایک طلاق اور تین طلاق دونوں کو محتمل ہے۔ شاید راوی نے "البتۃ" کو تین سمجھا اور اپنی سمجھ کے اعتبار سے تین طلاق کی صراحت کردی اور اس سلسلہ میں اس سے غلطی واقع ہوگئی علامہ نووی رحؒ نے جس صحیح حدیث کا حوالہ دیا ہے وہ سنن ابوداؤد میں ان الفاظ کے ساتھ مروی ہے۔

عن نافع بنِ عجيزٍ بن عبد يزيد بن ركانةَ اَنَّ رُكَانَةَ طَلَّقَ امرأتَه سهمةَ البتةَ فَاَخْبَرَ النبيَّ صلى الله عليه وسلم بذالك وقال واللهِ ما اَرَدْتُّ الّا واحدةً فَقَالَ رسولُ اللهِ صلى اللهِ ما اردتَّ الا واحدةً فقال ركانةُ واللهِ ما اردتُّ الا واحدةً

نافع بن عجیز ابن عبد یزید ابن رکانہ بیان کرتے ہیں کہ رکانہ رضؓ نے اپنی بیوی سہمہ کو طلاق البتۃ دیدی اور اسکی خبر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دی اور کہا خدا کی قسم میں نے صرف ایک ہی طلاق کا ارادہ کیا تھا تو حضور نے فرمایا خدا کی قسم تم نے ایک ہی کا ارادہ کیا تھا؟ تو رکانہ نے کہا خدا کی قسم میں نے ایک ہی کا ارادہ کیا تھا تو حضور صلی اللہ

فَرَدَّهَا اليه رسولُ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم (ابوداؤد ص ۳۰۰ ج ۱)

علیہ وسلم نے عورت کو رکانہ کی طرف لوٹا دیا۔

یہی روایت سنن ابو داؤد میں عبداللہ ابن علی کی روایت سے بھی مروی ہے تین طلاق والی روایت کے راوی ابن جریج ہیں اور "البتۃ" والی روایت کے راوی (۱) نافع ابن عجیز ابن عبد یزید بن رکانہ رضؓ (۲) عبداللہ بن علی ابن یزید ابن رکانہ رضؓ ہیں۔

امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ ان روایتوں کی تحقیق کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

قال ابوداؤد حدیث نافع بن عجیز وعبد اللّٰه بن علی ابن یزید بن رکانة عن ابیه عن جدّه ان رکانة طلق امرأته فردها اليه النبی صلى اللّٰه عليه وسلم اصح لان ولد الرجل واهله اعلم به ان رکانة انما طلق امرأته البتة فجعلها النبی صلى اللّٰه عليه وسلم واحدة۔

(ابوداؤد ص ۲۹۹ ج ۱)

امام ابو داؤد کہتے ہیں نافع ابن عجیز اور عبداللہ ابن علی ابن یزید ابن رکانہ اپنے باپ (علی) اور وہ عبداللہ کے دادا (یزید) سے روایت کرتے ہیں کہ رکانہ نے اپنی بیوی کو طلاق دی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیوی کو ان کی طرف لوٹا دیا یہ حدیث اصح ہے کیونکہ آدمی کا لڑکا اور اس کے گھر والے اس کے سلسلہ میں زیادہ معلومات رکھتے ہیں کہ رکانہؓ نے تو اپنی بیوی کو طلاق البتۃ ہی دی تھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ایک ہی قرار دیا تھا۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

هذا اصح من حديث ابن جريج (ابوداؤد ص ۳۰۱ ج ۱)

یہ (یعنی طلاق البتۃ والی حدیث) ابن جریج کی حدیث سے اصح ہے۔

علامہ ابن حجرؒ مسند احمد اور ابوداؤد کی ان روایتوں کے بارے میں کہتے ہیں۔

وفی سندھما ابن اسحٰق وفیہ مقال۔ (بلوغ المرام ص ۱۳۵)

ان دونوں کی سند میں ابن سحٰق ہیں اور ان کے سلسلہ میں کلام ہے۔

ابن اسحاق کے بارے میں کتب اسماء الرجال سے تحقیق کرتے ہوئے مولانا سرفراز صفدر صاحب لکھتے ہیں امام نسائیؒ فرماتے ہیں کہ وہ قوی نہیں (ضعفائے صغیر للنسائی ص ۵۲) امام ابوحاتمؒ فرماتے ہیں کہ وہ ضعیف ہے (کتاب العلل ص ۴۳۲ ج ۱) امام دارقطنیؒ فرماتے ہیں وہ قابل احتجاج نہیں محدث سلیمان تیمیؒ فرماتے ہیں کہ وہ کذاب تھا امام ہشام ابن عروہ کہتے ہیں کہ وہ کذاب تھا امام یحییٰ ابن سعید القطانؒ فرماتے ہیں کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ کذاب ہے (میزان ص ۴۲۱ ج ۳)

(عمدۃ الاثاث ص ۱۰۹)

الحاصل سنن ابوداؤد اور مسند احمد بن حنبل کی یہ روایت جو ابن جریج اور ابن اسحاق کے طرق سے مروی ہے جس میں تین طلاق دینے کی صراحت ہے۔ ضعیف مرجوح اور ناقابلِ استدلال ہے اس کے برخلاف ابوداؤد کی وہ روایت جو نافع ابن عجیز اور عبداللہ بن علی کے طریق سے مروی ہے جس میں "البتۃ" کی صراحت ہے وہ قوی راجح اور قابل استدلال ہے۔

یہ مختصر مباحث مسئلہ زیر بحث کو سمجھنے کے لئے انشاء اللہ کافی ہوں گے اس لئے انہیں پر اکتفاء کیا جا رہا ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الکریم۔

المآخذ والمراجع

فہرست کتب	اسمائے مصنفین
القرآن الکریم	
صحیح بخاری شریف	امام محمد بن اسماعیل البخاری رح
صحیح مسلم شریف	امام ابوالحسین مسلم رح بن الحجاج
نسائی شریف	امام ابوعبدالرحمان احمد بن شعیب النسائی
ابوداؤد شریف	امام سلیمان بن الاشعث ابوداؤد السجستانی رح
ترمذی شریف	امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ الترمذی
موطأ امام مالک	امام مالک رح
شرح معانی الآثار	ابوجعفر احمد رح بن محمد الطحاوی رح
تفسیر ابن کثیر	حافظ ابوالفداء اسماعیل رح بن عمر رح ابن کثیر رح
تفسیر طبری	امام جریر طبری رح
تفسیر مظہری	قاضی ثناء اللہ پانی پتی رح
مدارک التنزیل	امام عبداللہ ابن احمد نسفی رح
المحلی	علامہ ابومحمد بن حزم الظاہری رح
مشکوٰۃ شریف	شیخ ولی الدین الخطیب التبریزی رح
فتح الباری	علامہ شہاب الدین المعروف بابن الحجر العسقلانی رح
نووی شرح مسلم	شیخ محی الدین ابوزکریا یحییٰ النووی رح

فہرست کتب	اسمائے مصنفین
تحفۃ الاحوذی	مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری رح
مسند امام احمد ابن حنبل	امام احمد ابن حنبل
مصنف عبدالرزاق	حافظ عبدالرزاق بن ہمام الصنعانی رح
مصنف ابن ابی شیبہ	امام ابوبکر بن ابی شیبہ رح
بیہقی سنن کبریٰ	امام ابوبکر احمد بن الحسین البیہقی رح
مرقات شرح مشکوٰۃ	ملا علی القاری رح
تہذیب سنن ابی داؤد بحوالہ عمدۃ الاثار	ابو عبداللہ شمس الدین محمد المعروف بابن القیم رح
دار قطنی	امام دار قطنی رح
التعلیق الحسن	علامہ ظہیر الدین شوق نیموی رح
آثار السنن	علامہ ظہیر الحسن شوق نیموی رح
إعلاء السنن	علامہ ظفر احمد تھانوی رح
بلوغ المرام	الحافظ ابن الحجر عسقلانی رح
عمدۃ الاثاث	مولانا سرفراز صفدر صاحب رح
میزان الاعتدال	حافظ شمس الدین الذہبی رح
حجۃ اللہ البالغہ	شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رح
بدائع الصنائع	امام علاء الدین ابوبکر الکاسانی رح
بدایۃ المجتہد	علامہ ابن الرشد الاندلسی رح
منہاج السنہ	ابو العباس تقی الدین احمد المعروف بابن تیمیہ رح
المنتقی	حافظ شمس الدین الذہبی رح
فتح القدیر	شیخ کمال الدین ابن الہمام رح

فہرست کتب	اسمائے مصنفین
المقنع	امام موفق الدین عبداللہ بن احمد بن قدامہؒ
عمدۃ القاری	حافظ بدرالدین العینیؒ
حاشیہ سندھی	علامہ ابوالحسن سندھیؒ
شرح نخبۃ الفکر	حافظ ابن الحجر عسقلانیؒ
فتاویٰ عزیزی	شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ
لطائف قاسمی	حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ
کفایہ بحوالہ رکعات التراویح	امام خطیب البغدادیؒ
الانتفاد الرجیع بحوالہ رکعات التراویح	نواب صدیق حسن صاحب بھوپالیؒ
قیام اللیل بحوالہ التراویح	امام محمد بن نصر المروزیؒ
مکتوب حضرت مولانا نانوتوی صاحب (مندرجہ لطائف قاسمی)	حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ
مکتوب حضرت مولانا گنگوہی صاحب	حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ
رسالۂ تراویح مندرجہ تالیفات رشیدیہ	حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی
رکعات تراویح	مولانا حبیب الرحمان محدث اعظمیؒ
ضمیمہ رکعات التراویح	مولانا عبداللہ غازی پوریؒ
الدین الخالص	نواب صدیق حسن صاحب بھوپالیؒ
رسالہ المآثر	ایڈیٹر مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی

چھٹا محاضرہ علمیہ

بر موضوع

ردِّ غیر مقلدیت

پیش کردہ

جناب مولانا مفتی محمد راشد صاحب اعظمی

استاذ فقہ و تفسیر دار العلوم دیوبند

فہرست مضامین

- مسائل نماز ۳
- تکبیر تحریمہ میں ہاتھ کانوں تک اٹھانا چاہیے ۳
- ناف کے نیچے ہاتھ باندھنا ۴
- ان لوگوں کے اہل حدیث ہونے کا مطلب ۶
- چاروں اماموں میں سے کوئی بھی سینے پر ہاتھ باندھنے کے قائل نہیں ۶
- جہری نماز میں بسم اللہ آہستہ سے پڑھنا ۷
- امام کے پیچھے قراءت نہیں کرنی چاہیے ۷
- نماز میں آمین آہستہ سے کہنا ۱۳
- نماز کے اندر صرف تکبیر تحریمہ میں رفع یدین ۱۷
- رکوع میں رفع یدین ۱۸
- دوسری رکعت سے اٹھتے وقت رفع یدین ۱۸
- سجدوں کے لیے رفع یدین ۱۹
- نمازِ وتر واجب ہے ۲۴
- وتر کی تین رکعتیں ایک ہی سلام سے ثابت ہیں ۲۶

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للّٰہ رب العلمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الکریم.

اس محاضرہ میں نماز سے متعلق ان مسائل کو احادیث صحیحہ کی روشنی میں ثابت کرنے کی سعی کی گئی ہے جن میں غیر مقلدین اہل حق کی مخالفت کرتے ہیں۔ یاد رکھنے کی سہولت کے پیش نظر تفصیل سے گریز کیا گیا ہے۔

مسائلِ نماز

''تکبیر تحریمہ میں ہاتھ کانوں تک اٹھانا چاہیے''

عن مالك ابن الحويرثؓ قال: كان رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم اذاكبر رفع يديه حتي يحاذى بهما اُذُنيه، وفي رواية حتي يحاذى بهما فروع اذنيه. (متفق عليه مشكوٰة: ج:۱، ص:۷۵. باب صفة الصلوٰة مسلم: ج:۱، ص:۱۶۸)

ترجمہ: حضرت مالک بن الحویرث رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھوں کو اٹھاتے تھے یہاں تک کہ انہیں کانوں کے برابر کر دیتے اور ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں یہاں تک کہ ہاتھوں کو کانوں کے اوپری حصہ کے مقابل کر دیتے۔

وذكر الطيبى، ان الشافعىؒ حين دخل مصر سئل عن كيفية رفع اليدين عند التكبير، فقال: يرفع المصلى يديه بحيث يكون كفاه حذاء منكبيه وابها ماة حذاء شحمتى اذنيه واطراف اصابعه حذاء فروع اذنيه. لانه جاء فى رواية. يرفع اليدين الى المنكبين وفى رواية. الاذنين وفى رواية. الى فروع الاذنين: فعمل الشافعى بما ذكرناه فى رفع اليدين، جمعًابين الروايات الثلاث. (مرقاة المفاتيح: ج:۲، ص:۲۵٤)

ترجمہ: طیبیؒ نے ذکر کیا ہے کہ جب امام شافعیؒ مصر تشریف لے گئے تو ان سے تکبیر میں رفع یدین کی کیفیت کے بارے میں سوال کیا گیا؟ تو انہوں نے ارشاد فرمایا کہ نماز پڑھنے والا اپنے دونوں ہاتھوں کو

اس طور پر اٹھائے کہ اس کی دونوں ہتھیلی اس کے دونوں کندھوں کے اور اس کے دونوں انگوٹھے اس کے دونوں کانوں کی لوؤں کے برابر اور اس کی انگلیوں کے کنارے اس کے کانوں کے اوپری حصوں کے برابر ہو جائیں اس لیے کہ ایک روایت میں آیا ہے کہ دونوں ہاتھوں کو کندھوں تک اٹھائے دوسری روایت میں ہے کہ دونوں ہاتھ کانوں تک اٹھائے اور تیسری روایت میں ہے کہ دونوں ہاتھ کانوں کے اوپری حصوں تک اٹھائے۔ تو دیکھئے! حضرت امام شافعیؒ نے رفع یدین کے سلسلہ میں تینوں روایتوں کو جمع کرتے ہوئے اس شکل پر عمل کیا جس کو ہم نے ذکر کیا۔

الحمدللہ احناف کا اسی پر عمل ہے۔ لیکن اس کے برخلاف غیر مقلدین کہتے ہیں کہ ہاتھ صرف کندھوں تک اٹھانا چاہیے۔

چنانچہ خالد گرجاکھی صاحب لکھتے ہیں:

''اس کے بعد اللہ اکبر کہہ کر ہاتھوں کو کندھوں تک اٹھائے''۔ (صلاۃ النبی: ص:۱۵۲)

امام خاں نوشہروی لکھتے ہیں:

''تکبیر کے وقت دونوں ہاتھ کندھوں تک یا ذرا اور اوپر اٹھانا چاہیے''۔ (اہل حدیث کے دس مسئلے: ص:۲۸)

ناف کے نیچے ہاتھ باندھنا

عن علقمه بن وائل بن حجر عن أبيه قال: رأيت النبى صلى الله عليه وسلم يضع يمينهٗ على شمالهٖ تحت السرة. (مصنف ابن ابی شیبہ: طبع: کراچی: ج:۱، ص:۳۹)

قال الحافظ قاسم بن قُطْلُوْبغا فى تخريج احاديث الاختيار شرح المختار. هذا سندٌ جيدٌ. وقال العلامة محمد ابوالطيب المدنى فى شرح الترمذي. هذا حديث قوى من حيث السند. وقال المحقق عابد السندهى فى طوالع الانوار. رجاله ثقاة.

ترجمہ: علقمہ بن وائل اپنے والد یعنی وائل ابن حجر سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ نماز میں آپ اپنے دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر ناف کے نیچے رکھے ہوئے ہیں۔

نیز اس سلسلہ میں حضرت علیؓ، حضرت انسؓ، حضرت ابو ہریرہؓ اور دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مختلف روایتیں آئی ہیں۔

سینے پر ہاتھ باندھنے کی بھی روایتیں ہیں۔ لیکن اس درجہ قوی نہیں ہیں، لیکن ان تمام روایتوں کو بالائے طاق رکھ کر غیر مقلدین ہاتھوں کو سینے کے اوپر باندھنے پر مُصر ہیں اور ناف کے نیچے ہاتھ باندھنے کو نامناسب اور بے دلیل سمجھتے ہیں۔

مولوی خالد گرجاکھی لکھتے ہیں:

''مذکورہ طریقہ کے مطابق سینہ پر ہاتھ باندھنا ہی صحیح احادیث سے ثابت ہوتا ہے۔ زیر ناف باندھنا ویسے ہی نامناسب معلوم ہوتا ہے نیز زیر ناف ہاتھ باندھنے کی دلیل بھی کوئی نہیں ہے''۔ (صلاۃ النبی: ص: ۱۵۷)

دیکھا! صحابیِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو کہتے ہیں میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ناف کے نیچے ہاتھ باندھے ہوئے دیکھا۔ اور جناب اہل حدیث صاحب فرماتے ہیں کہ ''زیر ناف ہاتھ باندھنا ویسے ہی نامناسب معلوم ہوتا ہے''۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کو نامناسب کہنے والا اہل ایمان بھی رہ جاتا ہے کہ نہیں؟ اہل حدیث ہونا تو دور کی بات ہے۔ لیکن یہ گروہِ مقدس جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی مبارک احادیث کے ساتھ چاہے جو بھی سلوک کرے، لیکن رہے گا اہل حدیث ہی۔

حکیم فیضِ عالم نے تو اس سنت کو نامناسب کہنے سے بھی آگے بڑھ کر اس کا استہزاء کیا ہے۔ جناب کی گل افشانی دیکھئے! فرماتے ہیں:

''یہاں ایک لطیفہ یاد آیا ہے کہ خلفائے بنی عباس میں سے ہارون کا ایک نماز میں ازار کھل گیا۔ اور اس نے سینے سے ہاتھ نیچے کر کے ازار بند سنبھال لیا۔ نماز سے فراغت کے بعد مقتدیوں نے حیرانی سے ہارون رشید کے اس فعل کو دیکھا۔ قاضی ابو یوسف صاحب نے فتویٰ دیا کہ ناف کے نیچے ہاتھ باندھنا ہی صحیح ہے''۔ (اختلاف امت کا المیہ: ص: ۷۸)

دیکھئے! جو عمل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول ہے جسے حضرت علیؓ ''سنت'' حضرت انسؓ ''اخلاق نبوت'' میں شمار کرتے ہیں۔ یہ غیر مقلد ایک جعلی واقعہ گڑھ کر اس کا مذاق اڑا رہا ہے۔ رہی امام ابو یوسفؒ کے خلاف بدگمانی اور بدزبانی تو اکابرِ امت کے ساتھ تو ان حضرات کا رات و دن کا یہی

مشغلہ ہے۔اس کے بغیر تو ان کے یہاں اہل حدیث ہونے کا تصور بھی ممکن نہیں ہے۔

ان لوگوں کے اہل حدیث ہونے کا مطلب

ان حضرات کے اہل حدیث ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ لوگ احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کرتے ہیں۔ بلکہ اہل حدیث ہونے کا مطلب ان حضرات کے نزدیک یہ ہے کہ ہم جو عمل کرلیں وہ حدیث ہوجاتا ہے۔اور ہمارے عمل ہی کا نام بخاری اور مسلم ہے۔

چنانچہ سینے پر ہاتھ باندھنے کی ایک روایت بھی بخاری اور مسلم میں نہیں آئی ہے۔لیکن مولانا ثناء اللہ امرتسری صاحب بڑی جسارت کے ساتھ لکھتے ہیں:

''سینہ پر ہاتھ باندھنے اور رفع یدین کرنے کی روایات بخاری و مسلم اور ان کی شروحات میں بکثرت ہیں''۔(فتاویٰ ثنائیہ: ج:۱،ص:۴۴۳)

میں تمام غیر مقلدوں سے گذارش کرتا ہوں کہ اس سلسلہ کی ایک روایت بھی بخاری اور مسلم سے نکال کر دکھلائیں اور اگر ایسا نہیں کرتے اور انشاء اللہ ہرگز نہیں کرسکتے تو پھر آپ کو ماننا پڑے گا کہ آپ جو عمل کرلیتے ہیں اسی کا نام آپ لوگوں کے یہاں بخاری اور مسلم ہے اور یہی مطلب ہے آپ لوگوں کے اہل حدیث ہونے کا۔

چاروں اماموں میں سے کوئی بھی سینے پر ہاتھ باندھنے کا قائل نہیں ہے

یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ چاروں اماموں میں سے کوئی بھی سینے پر ہاتھ باندھنے کا قائل نہیں ہے۔(ملاحظہ ہو رحمۃ الامۃ فی اختلاف الائمہ،ص:۳۲)

بلکہ ایک روایت میں تو اس سے ممانعت آئی ہے۔

علامہ ابن قیم شاگرد علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

ویکرہ ان یجعلها علی الصدر ذالك لماروی عن النبی ﷺ انه نهی عن التکفیر وهو وضع الید علی الصدر. (بدائع الفوائد: ج:۳،ص:۹۱)

اور سینہ پر ہاتھ رکھنا مکروہ ہے۔اس لیے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے تکفیر سے منع کیا ہے۔اور تکفیر سینے پر ہاتھ رکھنے کو کہتے ہیں۔

جہری نماز میں بسم اللہ آہستہ پڑھنا

عن انسؓ ان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم وابا بکر وعمر کانوا یفتتحون الصلوٰۃ بالحمدللّٰہ رب العٰلمین. (اخرجہ مسلم: ج:۱، ص:۱۷۲، مشکوٰۃ شریف: ج:۱، ص:۷۹، باب صفۃ الصلوٰۃ بخاری: ج:۱، ص:۱۰۳)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما الحمد اللہ رب العالمین کے ذریعہ نماز شروع کیا کرتے تھے۔

قال العینی واحادیث الجھر وان کثرت رواتھا فکلھا ضعیفۃ ولیست مخرجۃ فی الصحاح ولا فی الاسانید المشھورۃ. (حاشیۃ البخاری: ص:۱۰۳، ج:۱)

ترجمہ: علامہ عینیؒ فرماتے ہیں کہ جہر کی روایتیں اگرچہ ان کے راوی بہت ہیں مگر وہ سب ضعیف ہیں اور صحاح نیز اسانید مشہورہ میں مذکور نہیں ہیں۔

اس کے برخلاف غیر مقلدین کا کہنا ہے کہ جہری نماز میں بسم اللہ پکار کر پڑھنا چاہیے جناب یونس دہلوی صاحب فرماتے ہیں:

''جہری نماز میں پکار کر اور سری نماز میں آہستہ پڑھنا بہتر ہے''۔ (دستور المتقی: ص:۹۲)

یعنی جس عمل کو حضور ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ نہیں فرماتے تھے۔ وہی ان کے نزدیک بہتر ہے۔

امام کے پیچھے قراءت نہیں کرنی چاہیے

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ''

(الاعراف: پارہ ۹، آیت:۲۰۴)

ترجمہ: اور جب قرآن پڑھا جائے تو اس کی طرف کان لگائے رہو۔ اور چپ رہو۔ تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

اہل علم کا اجماع ہے کہ اس آیت سے مراد امام کا نماز میں قرآن پڑھنا ہے۔ علامہ حافظ ابوعمر یوسف بن عمر المعروف بابن عبدالبر متوفی ۴۶۳ھ فرماتے ہیں:

مع اجماع اھل العلم ان مراد اللّٰہ من ذلک فی الصلوٰۃ المکتوبۃ

(التمہید، ص:۳۰، ج:۱۱)

ترجمہ: اہل علم کا اجماع ہے کہ اللہ کی مراد اس سے فرض نمازوں میں چپ رہنا ہے۔

امام موفق الدین عبداللہ بن احمد بن قدامہ متوفی: ۶۲۰ھ فرماتے ہیں:

عن سعید بن المسیب والحسن وابراهیم ومحمد بن کعب والزهری انها نزلت فی شان الصلاة وقال زید بن اسلم وابوالعالیه کانوا یقرؤن خلف الامام فنزلت "وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ" الایة وقال احمد فی روایة ابی داؤد اجمع الناس علی ان هذه الآیة فی الصلاة (المغنی: ج:۲، ص:۲۲۹)

ترجمہ: سعید بن مسیّب حسن بصری، ابراہیم محمد بن کعبؒ اور زہری کہتے ہیں آیت مذکورہ نماز کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہے۔ اور زید بن اسلم اور ابوالعالیہ فرماتے ہیں کہ لوگ امام کے پیچھے قراءۃ کرتے تھے تو یہ آیت نازل ہوئی امام ابوداؤد کی روایت کے مطابق امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ لوگوں کا اجماع ہے کہ یہ آیت نماز کے سلسلہ میں نازل ہوئی۔

جب ثابت ہوا کہ آیت کریمہ نماز کے بارے میں ہے۔ تو مطلب یہ ہوا کہ جب نماز میں امام قرآن کریم پڑھے تو مقتدی حضرات چپ چاپ سنیں۔ آیت کے عموم سے پتہ چلتا ہے کہ چاہے امام سرأ پڑھے، چاہے جہراً پڑھے چاہے مقتدی سن پاتا ہے یا نہیں سن پاتا۔ اسے چپ رہنا چاہیے "فاستمعوا" کے بعد "انصتوا" کا لفظ اس بات کو بتلانے کے لیے ہے کہ سن سکو تو سنو! ورنہ چپ چاپ رہو!۔

امام ابوبکر احمد بن علی رازی الجصّاص متوفی ۳۷۰ھ فرماتے ہیں:

وکما دلت الآیة علی النهی عن القراءة خلف الامام فیما جهر به، فهی دلالة علی النهی فیما یخفی. لانه اوجب الاستماع والانصات. عند القرأة ولم یشترط فیه حال الجهر من الاخفاء. فاذا جهر فعلینا الاستماع والانصات. واذا خفی فعلینا الانصات. بحکم اللفظ لعلمنابه قاری القرآن.

ترجمہ: پھر یہ آیت جہری نمازوں کی طرح سری نمازوں میں بھی قراءت کرنے سے مانع ہے کیوں کہ آیت میں جہر و سر کی قید کے بغیر محض قراءت قرآن کے وقت استماع وانصات کو واجب کیا گیا ہے۔ لہٰذا امام کی جہری قراءت کے وقت استماع اور انصات ہم پر ضروری ہوگا۔ اور جب وہ سری قراءت

کرے تو ہم پر انصات ضروری ہے۔ لفظ انصات کو دیکھتے ہوئے کیوں کہ ہمیں معلوم ہے کہ امام قرآن پڑھ رہا ہے۔

اس سلسلہ میں علامہ ابن تیمیہ متوفی ۷۲۸ھ کا یہ قول مفصل اور محققانہ ہے:

"فان للعلماء فيه ثلاثة اقوال: قيل ليس له ان يقرأ حال جهر الامام اذا كان يسمع لا بالفاتحة ولاغيرها، وهذا قول الجمهور من السلف والخلف وهذا مذهب مالك، واحمد، وأبى حنيفة وغيرهم واحدقولى الشافعي– وقيل يجوز الامران. والقراء ة افضل. ويروى هذا عن اوزاعى واهل الشام وليث بن سعد وهو اختيار طائفة من اصحاب احمد وغيرهم–وقيل بل القرأة واجبة. وهو القول الاخير للشافعي، وقول الجمهور هو الصحيح. فانه سبحانه تعالىٰ. قال:"وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ" قال احمد اجمع الناس على انها نزلت فى الصلوٰة.

(فتاوی شیخ الاسلام: ج: ۲۲، ص: ۲۹٤)

ترجمہ: علماء کے اس سلسلہ میں تین قول ہیں ایک یہ کہ مقتدی کے لیے امام کی جہر کی حالت میں جب کہ مقتدی سن رہا ہو قراءت جائز نہیں ہے۔ نہ تو فاتحہ نہ اس کے علاوہ کی۔ یہی قول سلف وخلف کا ہے۔ یہی امام مالک اور امام احمد امام ابوحنیفہ وغیرہ کا مذہب ہے۔ اور ایک قول امام شافعیؒ کا بھی یہی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ دونوں جائز ہے۔ لیکن پڑھنا افضل ہے۔ یہی اوزاعی - اہل شام - لیث بن سعد اور امام احمد کے اصحاب کی ایک جماعت نے اختیار کیا ہے۔ تیسری رائے یہ ہے کہ قراءت واجب ہے۔ اور یہی امام شافعیؒ کا آخری قول ہے۔ لیکن جمہور کا قول صحیح ہے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے "وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ إلخ" امام احمد فرماتے ہیں کہ لوگوں کا اجماع ہے کہ یہ آیت نماز کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہے۔

امام کے پیچھے قراءت کو قرآن کریم کے اس صاف صاف منع کر دینے کے بعد اب اس مسئلہ میں کسی بھی دلیل اور کلام کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن احادیث چوں کہ قرآن کریم کی شارح ہیں۔ اس لیے اس خاص ممانعت کے سلسلہ میں وارد سیکڑوں احادیث کے ذخیرہ سے ہم صرف دو حدیثیں

پیش کرتے ہیں۔

(۱) عن ابی موسیٰ الاشعری قال: ان رسول اللّٰہ ﷺ خطبنا فبین لنا سنتنا، وعلمنا صلواتنا فقال: اذاصلیتم فاقیموا صفوفکم، ثم لیؤمکم احدکم فاذاکبر فکبروا واذا قرأ فانصتوا و اذا قال. غیر المغضوب علیهم ولاالضالین فقولوا: آمین. یجبکم اللّٰہُ.

(مسلم: ج:۱، ص:۱۷٤)

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے مروی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے سامنے خطبہ دیا اور ہمارے لیے طریقہ زندگی کو بیان فرمایا، اور ہمیں ہماری نماز سکھائی، اور فرمایا کہ جب تم نماز کے لیے تیاری کرو تو اپنی صفوں کو درست کرو اور تم میں سے ایک آدمی تمہاری امامت کرے! پھر جب وہ تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو! اور جب وہ قراءت کرے تو تم چپ رہو! اور جب وہ غیر المغضوب علیهم ولا الضالین کہے تو تم آمین کہو! اللہ تعالیٰ تمہاری دعا کو سنیں گے۔

اس صحیح حدیث میں بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک الفاظ ہیں: ''واذا قرأ فانصتوا'' یعنی جب امام پڑھے خواہ سراً خواہ جہراً تو تم چپ چاپ رہو۔ چاہے سنو چاہے نہ سنو۔

(۲) عن جابر قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم من کان له امام فقرأة الامام قرأة له" (مسند احمد بن منیع بحواله فتح القدیر: ج:۱، ص:۲۹۵، وقال البوصیری فی اتحاف الخیرة المهرة بزوائد المسانید العشرة: ج:۲، ص:۲٤۳. صحیح علی شرط الشیخین)

ترجمہ: جس شخص کا کوئی امام ہو تو امام کی قراءت اس کی قراءت ہوگی۔

اس حدیث میں مَن کا لفظ عام ہے۔ جس نے کسی امام کی اقتداء کر لی، خواہ نماز جہری یا سری ہو تو بلا کسی تخصیص کے امام کے پیچھے الگ سے نہ پڑھے۔ کیوں کہ امام کی قراءت شرعاً اس کی قراءت مان لی گئی ہے۔ اب لاصلاة الابفاتحة الکتاب والی حدیث پر عمل ہو گیا ہے۔ اس لیے امام کے پیچھے پڑھنا۔ یا امام کے سکتوں میں پڑھنا، یا امام کے سورۃ فاتحہ پڑھنے کے بعد رکنے کی حالت میں پڑھنا۔ قرآن وحدیث کی اس صریح ممانعت کے خلاف ہے۔ قرآن وحدیث سے دور دور تک اس کا کہیں ثبوت نہیں ہے۔ بلکہ امام ابن تیمیہؒ نے اس کو بدعت لکھا ہے: فرماتے ہیں:

وایضا فلوکان الصحابة کلهم یقرؤن الفاتحة خلفه، اما فی السکتة الاولی، واما فی السکتة الثانیة، لکان هذا مما تتوفرلهم الدواعی علی نقله فکیف ولم ینقل هذاأحدٌ من الصحابة، انهم کانوا فی السکتة الثانیة خلفه یقرؤون الفاتحة مع ان ذلك لوکان مشروعاً لکان الصحابة احق الناس بعلمه وعمله. فعلم انه بدعة. (مجموعه فتاویٰ شیخ الاسلام: ج:۲۳، ص:۲۷۸-۲۷۹)

ترجمہ: نیز اگر سارے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سورہ فاتحہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے پڑھتے، چاہے پہلے سکتہ میں، یا دوسرے سکتہ میں، تو یہ وہ چیز تھی جسے بکثرت منقول ہونا چاہیے تھا، جب کہ ایک صحابیؓ سے بھی اس طرح کی کوئی چیز منقول نہیں ہے۔ حالاں کہ اگر یہ چیز مشروع ہوتی تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو اسے جاننے اور اس پر عمل پیرا ہونے کا سب سے زیادہ حق تھا۔ تو ثابت ہوا کہ یہ عمل بدعت ہے۔

خود علامہ یمن محمد بن اسماعیل امیر یمانی متوفی ۱۱۸۲ھ تحریر فرماتے ہیں:

ثم اختلف القائلون بوجوب القرأة فقیل فی محل سکتات الامام وقیل فی سکوته بعد تمام القراءة- ولا دلیل لهذین القولین فی الحدیث.

ترجمہ: پھر قراءت کو واجب کہنے والوں نے اختلاف کیا بعض کہتے ہیں کہ امام کے سکتوں کے موقع پر پڑھے۔ بعض کہتے ہیں امام کے قراءت مکمل کر لینے کے بعد سکوت کرتے وقت پڑھے لیکن ان دونوں قولوں کی حدیث میں کوئی دلیل نہیں ہے۔

انہوں نے صاف فرمادیا کہ کسی بھی سکتے میں پڑھنے کی بات کسی بھی حدیث سے ثابت نہیں ہے۔

علامہ ابن تیمیہؒ اس سلسلہ میں بڑی فیصلہ کن بات فرماتے ہیں:

فالنزاع من الطرفین، لکن الذین ینهون عن القراءة خلف الامام جمهور السلف والخلف ومعهم الکتاب والسنة الصحیحة والذین اوجبوها علی المأموم. فحدیثهم ضعیفة. عند الائمة.

(تنوع العبادات: ص:۸۶. بحواله احسن الکلام: ص:۱۶۵)

ترجمہ: مسئلہ زیر بحث میں دونوں طرف سے نزاع ہے۔ لیکن قراءت خلف الامام سے منع کرنے والے جمہور خلف وسلف ہیں، اور ان کے ساتھ کتاب الٰہی اور احادیث صحیحہ ہیں، اور جو لوگ مقتدی پر قراءت واجب کرتے ہیں ان کی مستدل حدیث ائمہ حدیث کے نزدیک ضعیف ہے۔

لیکن ان اہل حدیث کہلانے والوں کا جواب نہیں فرماتے ہیں:

''وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا'' (الاعراف: پارہ: ۹ ۲۰۴)؟

جب قرآن پڑھا جائے تو سنو اور خاموش رہو یا حدیث و اذا قرأ فانصتوا (بشرط صحت)

جب امام قراءت کرے تو خاموش رہو، کا مطلب یہ ہے کہ جہری نمازوں میں مقتدی سورۃ فاتحہ کے علاوہ باقی قراءت خاموشی سے سنیں امام کے ساتھ قرآن نہ پڑھیں، یا امام سورۃ فاتحہ کی آیات وقفوں کے ساتھ پڑھے تاکہ مقتدی بھی احادیث صحیحہ کے مطابق سورۂ فاتحہ پڑھ سکیں یا امام سورۂ فاتحہ کے بعد اتنا سکتہ کرے کہ مقتدی سورہ فاتحہ پڑھ لیں۔ (تفسیری حواشی جناب صلاح الدین یوسف: ص: ۲۔ شائع کردہ سعودی حکومت)

کیا سورۃ الفاتحہ قرآن میں داخل نہیں ہے؟ جو آپ اسے اذا قرئ القرآن سے خارج کر رہے ہیں؟ آپ امام کو سورۃ الفاتحہ وقفوں کے ساتھ پڑھنے کی تلقین کس حدیث سے کر رہے ہیں۔ نماز میں آپ کا حکم چلے گا یا اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا؟ نیز امام کو سورۃ الفاتحہ پڑھنے کے بعد اتنا طویل سکتہ کرنے کا حکم آپ کس حدیث سے دے رہے ہیں؟ کیا نماز آپ کی ذاتی ملکیت ہے کہ آپ جو چاہیں اس پر تصرف کریں؟ ''واذا قرئ فانصتوا'' مسلم شریف کی روایت ہے لیکن چوں کہ آپ کے عمل کے خلاف ہے اس لیے بین القوسین بشرط صحت لکھ کر آپ نے اس کی صحت میں شبہ کا اظہار کر دیا۔ ان سب کے باوجود بھی آپ اہل حدیث ہی رہے۔ تعجب ہے۔ سعودی حکومت پر کہ اس نے ایسی تفسیر شائع کی ہے، جس کی صرف پانچ سطروں کے اندر قرآن وحدیث کی اس قدر خلاف ورزیاں ہیں۔ اس طرح کی تفسیروں کی اشاعت سے امتِ مسلمہ اور قرآن کریم کی کیا خدمت انجام پا سکتی ہے؟۔

اسی طرح ایک صاحب لکھتے ہیں کہ:

''جو شخص امام کے پیچھے ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز ناقص ہے، کالعدم بے کار اور باطل ہے۔ (فصل الخطاب فی قراءۃ فاتحۃ الکتاب، ص: ۱۔ طبع ثانی مطبوعہ کتب خانہ اہل حدیث لاہور)

یہ شخص جناب رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرامؓ سمیت تقریباً پوری امت مسلمہ کی نمازیں کھا جانے کے درپے ہے۔ کیا قرآن وحدیث کے خلاف اسی ذہنیت کا نام اہل حدیث ہونا ہے۔

اسی طبقہ کے ایک اور صاحب گل کھلاتے ہیں "مدرک رکوع سے فاتحہ مفقود ہوتی ہے لہٰذا اس کی نماز نہیں، جس کی نماز نہیں، وہ بے نماز ہے۔ بے نماز کافر ہے اور وہ مخلد فی النار ہے؟۔ (اتمام الرکوع فی ادراک الرکوع، ص:۱، طبع کردہ منیجر رسالہ اہل حدیث، صدر دہلی، بحوالہ احسن الکلام: ص:۵۵)

اب آپ ہی فیصلہ فرمائیں کہ یہ شخص کس کس کو جہنم میں لے جانا چاہتا ہے۔

"نماز میں آمین آہستہ سے کہنا"

قال عطاء آمین دعاء (بخاری: ج:۱، ص:۱۰۷)

ترجمہ: حضرت عطاؒ فرماتے ہیں کہ آمین دعا ہے۔

وقال اللّٰہ تبارك وتعالیٰ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً. (۵۵:۸)

ترجمہ: اور باری تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ پکارو اپنے رب کو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے۔

جب آمین دعا ہے۔ اور دعا آہستہ ہی ہونی چاہیے اور یہی بہتر ہے۔ لیکن کبھی کبھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے توجہ دلانے اور سکھانے کے لیے زور سے بھی پڑھ دی ہے۔

حافظ ابن القیم زاد المعاد میں فرماتے ہیں:

فاذا جهر به الامام احيانًا ليعلم المامومين فلابأس بذلك فقد جهر عمرؓ بالافتتاح ليعلم المامومين وجهرا بن عباس بقرائة الفاتحة فى صلوة الجنازة ليعلم انها سنة ومن هذا ايضا جهر الامام بالتأمين وهذا الاختلاف المباح الذى لايعنف فيه من فعله ولا من تركه. (بحوالہ آثار السنن: ج:۱، ص:۹۲)

ترجمہ: اگر کبھی امام قنوت نازلہ مقتدیوں کو سکھانے کے لیے جہر کے ساتھ پڑھ دے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ نے مقتدیوں کو سکھانے کے لیے "ثناء جہر" کے ساتھ پڑھی تھی۔ اسی طرح ابن عباسؓ نے نماز جنازہ میں سورۂ فاتحہ زور سے پڑھی تھی تاکہ مقتدیوں کو بتائیں کہ وہ سنت ہے۔ اسی قبیل سے امام کا آمین بھی زور سے پڑھنا ہے یہ وہ مباح اختلاف ہے جس میں جہر کرنے یا نہ کرنے والے پر کوئی سختی نہیں کی جاسکتی۔

عن أبی هریرةؓ أن رسول الله صلی الله علیه وسلم قال اذا قال الامام غیر المغضوب علیهم ولاالضالین فقولوا آمین. فانه من وافق قوله. قول الملائکة غفرله ما تقدم من ذنبه.

ترجمہ: رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب امام غیر المضوب علیهم ولاالضالین کہے تو تم آمین کہو۔ اس لیے کہ جس کا قول فرشتوں کے قول کے موافق ہو جائے گا تو اس کے گذشتہ گناہ معاف ہو جائیں گے۔

عن ابی هریرةؓ واذا قال ولاالضالین فقولوا آمین. (مسلم:ج:۱،ص:۱۷۷)

ترجمہ: جب امام ولا الضالین کہے تو تم آمین کہو۔

عن ابی موسیٰ الاشعری فی حدیث طویل.....واذا قال غیر المغضوب علیهم ولاالضالین فقولوا آمین یُجبْکم الله (مسلم:ج:۱،ص:۱۷٤)

ترجمہ: جب امام غیر المغضوب علیهم ولاالضالین کہے تو تم آمین کہو اللہ تعالیٰ تمہاری دعا قبول فرمائیں گے۔

ان روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ خود امام آہستہ آمین کہے گا اس لیے کہ اگر امام جہر کے ساتھ آمین کہتا تو سیاق کلام کا تقاضا تھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یوں فرماتے:

اذا قال آمین فقولوا آمین.

ترجمہ: جب امام آمین کہے تو تم آمین کہو۔

صاحب آثار السنن فرماتے ہیں:

قال النیموی یستفاد منه ان الامام لایجهربآمین وقال فی التعلیق الحسن قوله یستفادمنه الخ قلت لان تامین الامام لوکان مشروعاً بالجهر لما علق النبی صلی الله علیه وسلم تامینهم بقوله ولا الضالین بل السیاق یقتضی انه لم یقل الا هٰکذا واذا قال آمین فقولوا آمین. (آثار السنن مع التعلیق الحسن،ص:۹۵،ج:۱)

ترجمہ: نیمویؒ کہتے ہیں کہ حدیث سے یہ بات اخذ ہوتی ہے کہ امام آمین بالجہر نہیں کہے گا۔ تعلیق حسن میں حدیث سے اس ماخوذ بات کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ کہ اگر امام کا آمین بالجہر کہنا

مشروع ہوتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مقتدیوں کے آمین کہنے کو امام کے ولا الضالین کہنے پر معلق نہ کرتے، بلکہ سیاقِ کلام کا تقاضا تھا کہ یوں فرماتے کہ جب امام آمین کہے، تو تم آمین کہو۔

یہاں ایک بات اور بھی قابل غور ہے، حضور اکرم ﷺ کے اس ارشاد سے کہ جب قاری وامام ولا الضالین کہے تو تم آمین کہو، ثابت ہوتا ہے کہ سورۃ الفاتحہ امام ہی پڑھے گا مقتدی نہیں پڑھے گا۔ کیوں کہ اگر مقتدی بھی سورۃ الفاتحہ پڑھتا تو پھر یہ نہ فرماتے کہ جب امام ولا الضالین کہے تو تم آمین کہو۔ بلکہ آپ ﷺ یوں فرماتے کہ جب تم ولا الضالین کہہ چکو تو آمین کہو۔ دیکھئے یہ بخاری ومسلم کی تین روایتیں ہیں جن سے امام کا آہستہ سے آمین کہنا ثابت ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف بخاری ومسلم کی کسی ایک روایت سے بھی امام اور مقتدی کسی کے بھی زور سے آمین کہنے کا ثبوت نہیں ہوتا ہے۔ صاحب آثار السنن فرماتے ہیں:

قال النیموی لم یثبت الجهر بالتأمین عن النبی ﷺ ولا عن الخلفاء الاربعة وما جاء فی الباب فهو لا یخلو من شیئ. (آثار السنن: ج:۱، ص:۹۴)

ترجمہ: آمین بالجہر نہ تو نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے اور نہ ہی خلفائے راشدین سے اور اس باب میں جو بھی حدیث ہے وہ علت سے خالی نہیں ہے۔

جہر کے سلسلہ میں ابوداؤد اور ترمذی کی ایک حدیث پیش کی جاتی ہے۔

عن وائل بن حجر قال کان رسول الله صلی الله علیه وسلم اذا قرأ ولا الضالین قال آمین رفع بها صوته.

ترجمہ: وائل بن حجر کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب ولا الضالین پڑھتے تھے تو آمین کہتے تھے اور اس کے ساتھ آواز بلند فرماتے تھے۔ اس حدیث کے بارے میں علامہ نیموی فرماتے ہیں:

هو حدیث مضطرب قلت وجه الاضطراب انه روی من طریق سفیان عن وائل بن حجر ان النبی ﷺ قال آمین رفع بها صوته اومثل ذلك ومن طریق شعبه اخفی بهاصوته او نحوذلك ولیس حدیث سفیان اصح من حدیث شعبه کما زعمه البخاری وابوزرعه وغیرهما بل کلاهما متساویان وسیجئ تحقیقه فی حدیث الخفض انشاء الله فاضطرب الحدیث فی الرفع والخفض.....ولعل الامام البخاری مع شدة حرصه علی اثبات الجهر

بالتامین وصاحبه مسلما لم یخرجاه فی صحیحیهما لهذه العلة.

(اللہ اعلم بالصواب)

ترجمہ: یہ مضطرب حدیث ہے میں کہتا ہوں کہ اضطراب کی وجہ یہ ہے کہ یہ حدیث سفیان عن وائل بن حجر کے طریق سے مروی ہے، کہ نبی کریم ﷺ نے آمین کہا، اور اس کے ذریعہ اپنی آواز کو بلند فرمایا۔ یا اسی کے مثل مروی ہے، اور یہی حدیث طریق شعبہ سے مروی ہے، کہ نبی کریم ﷺ نے آمین کے ذریعہ اپنی آواز کو پست فرمایا۔ یا اسی کے مثل مروی ہے، اور حدیث سفیان حدیث شعبہ سے اصح نہیں ہے۔ جیسا کہ یہ امام بخاری اور ابوزرعہ وغیرہ کا خیال ہے بلکہ دونوں حدیث برابر درجے کی ہیں اور اس کی تحقیق انشاء اللہ آمین آہستہ کہنے کی حدیث کی بحث میں آئے گی۔ تو حاصل یہ ہوا کہ یہ حدیث مضطرب ہے۔ جہر اور سر کے درمیان۔ اسی علت کی وجہ سے شاید امام بخاری نے اثبات آمین بالجہر میں اپنی شدید رغبت کے باوجود اور اسی طرح سے امام مسلم نے بھی اپنی اپنی صحیح میں اس حدیث کو ذکر کرنے سے گریز کیا۔

آمین بالسر کے سلسلہ میں یہ دو صحیح حدیثیں بھی پیش نظر رکھنی چاہیے۔

عن الحسن عن سمرة بن جندب انه كان اذا صلى بهم سكت سكتين اذا فتح الصلاة واذا قال ولاالضالين سكت ايضًا هنيةً. فانكروا ذلك عليه فكتب الى ابى بن كعب فكتب اليهم ابى ان الامر كما صنع سمرة. (رواه احمد والدار قطنى واسناده صحيح. آثار السنن: ص: ۹۶)

ترجمہ: حسن بصری سے مروی ہے کہ سمرۃ بن جندبؓ جب لوگوں کو نماز پڑھاتے تھے تو دو سکتہ کرتے تھے، ایک نماز شروع کرنے کے وقت، دوسرا جب ولا الضالین کہہ لیتے تھے تو تھوڑا وقفہ فرماتے تھے، لوگوں نے اس پر انکار کیا، تو انہوں نے ابی بن کعب کے پاس اس صورت کو لکھا، تو انہوں نے جواب دیا مسئلہ وہی ہے جو سمرہ نے کہا۔

عن وائل بن حجر قال صلى بنا رسول الله صلى الله عليه وسلم فلما قرأ غير المغضوب عليهم ولاالضالين قال آمين. واخفى بها صوته. (رواه احمد والترمذى، وابوداؤد الطيالسى، والدار قطنى والحاكم) وآخرون واسناده صحيح وفى متنه اضطراب. وقال الحاكم فى المستدرك

هذا حديث صحيح على شرطهما اقره الذهبي.

ترجمہ: وائل بن حجر سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ہمیں نماز پڑھائی اور جب غیر المغضوب علیهم و لاالضالین پڑھا تو آمین کہا اور اس کے ذریعہ اپنی آواز کو پست رکھا۔

وجہ اضطراب شعبہ اور سفیان کی روایتوں کا اختلاف ہے لیکن شعبہ کی اس حدیث کی وجہ ترجیح امام نیموی ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

وعندی وجه حسن لترجيح رواية شعبة على مارواه الثوری وهو ان شعبة لم يكن يدلّس لا من الضعفاء ولا عن الثقات . اما الثوری فكان ربما يدلِسُ وقد عنعنه. (آثار السنن: ص: ۹۷)

ترجمہ: میرے نزدیک شعبہؒ کی روایت کو سفیانؒ کی روایت پر ترجیح کی نفیس وجہ ہے، وہ یہ کہ شعبہ تدلیس نہیں کرتے تھے نہ تو ضعفاء سے اور نہ ہی ثقات سے اور رہے سفیان تو وہ کبھی کبھی تدلیس کر جاتے تھے اور ان کی یہ روایت معنعن ہے۔

لیکن قرآن وسنت کے برخلاف غیر مقلدین کا کہنا ہے، کہ آمین اونچی آواز سے کہنا سنت ہے جو شخص ان آیات احادیث اور آثار صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے پیش نظر ان سے یہ کہے آہستہ آواز سے آمین کہو، تو وہ اسے تارک سنت سمجھ کر نہ صرف نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں، بلکہ اسے بے نصیب نامراد حتی کہ یہودی تک کہہ گذرتے ہیں۔

چنانچہ جماعت غرباء اہل حدیث کے سابق امام مفتی عبدالستار صاحب لکھتے ہیں:

''پس آج کل جو بھی ناعاقبت اندیش فتنہ انگیز اونچی آمین سے چڑھے اور کہنے والوں سے حسد رکھے وہ یہودی ہے۔ (فتوی آمین بالجہر، ص: ۳۴، بحوالہ حدیث اور اہل حدیث: ص: ۳۸۶)

مولوی نور محمد گرجاکھی یوں گل افشانی کرتے ہیں:

''اے منکرین آمین اور آمین بالجہر سے روکنے والو! سوچو کہ تم کس قدر بے نصیب اور نامراد ہو بلکہ اوروں کو بھی اس نعمت سے نامراد اور بے نصیب کرتے ہو''۔ (اثبات آمین بالجہر، ص: ۱۳، بحوالہ حدیث اور اہل حدیث: ص: ۳۸۷)

نماز کے اندر صرف تکبیر تحریمہ میں رفع یدین

شروع شروع میں نبی کریم ﷺ تکبیر تحریمہ، میں رکوع میں جاتے وقت، رکوع سے اٹھتے وقت،

سجدہ میں جاتے وقت، نیز سجدے سے اٹھتے وقت، اور دو رکعت کے بعد قیام کے وقت، رفع یدین فرماتے تھے۔ بعد میں تکبیر تحریمہ کے علاوہ باقی تمام موقعوں پر رفع یدین کرنا موقوف ہوگیا۔ چنانچہ سجدوں میں جاتے اور سجدوں سے اٹھتے وقت رفع یدین کے منسوخ ہونے کے سب ہی قائل ہیں فریق مخالف صرف رکوع میں جاتے اور اس سے اٹھتے وقت رفع یدین کرنے پر اب بھی مصر ہے، جب کہ ہم کہتے ہیں، کہ جس طرح سجدوں میں رفع یدین پہلے تھا اب نہیں ہے اسی طرح رکوع میں بھی رفع یدین پہلے تھا اب منسوخ ہو چکا ہے۔ اس سلسلے میں ترتیب وار دلائل پیش کیے جاتے ہیں۔

رکوع میں رفع یدین

عن عبداللّٰہ بن عمرؓ ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کان یرفع یدیہ حذو منکبیہ اذا فتتح الصلوٰۃ واذا کبر للرکوع واذا رفع رأسہ من الرکوع رفعھما کذلک ایضًا وقال سمع اللّٰہ لمن حمدہ وربنا لک الحمد وکان لایفعل ذلک فی السجود. (رواہ الشیخان)

ترجمہ: عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول ﷺ جب نماز شروع فرماتے تو اپنے دونوں ہاتھوں کو کندھوں کے برابر اٹھاتے تھے اور جب رکوع کی تکبیر کہتے اور جب رکوع سے سر اٹھاتے تب بھی اپنے دونوں ہاتھوں کو اٹھاتے تھے۔

قال النیمویؒ وفی الباب عن ابی حمید نالساعدیؓ ومالک ابن الحویرثؓ ووائل ابن حجرؓ وعلیؓ وغیرھم من اصحاب النبی ﷺ (آثار السنن: ص: ۱۰۰)

ترجمہ: علامہ نیموی فرماتے ہیں کہ اس باب میں ابوحمید ساعدیؓ، مالک بن الحویرث، اور وائل بن حجر وعلی وغیرہم صحابہؓ سے احادیث منقول ہیں۔

دوسری رکعت سے اٹھتے وقت رفع یدین

عن نافع ان ابن عمر کان اذا دخل فی الصلوٰۃ کبر ورفع یدیہ واذا رکع رفع واذا قال سمع اللّٰہ لمن حمدہ رفع یدیہ واذا قام من الرکعتین رفع یدیہ. رفع ذلک ابن عمر الی النبی ﷺ. (رواہ البخاری، بحوالہ آثار السنن: ص: ۱۰۱)

ترجمہ: نافع سے مروی ہے کہ ابن عمرؓ جب نماز میں داخل ہوتے تو تکبیر کہتے اور دونوں ہاتھوں کو

اٹھاتے تھے اور رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے اٹھ کر سمع اللہ لمن حمدہ کہتے وقت اور دوسری رکعت سے اٹھتے وقت رفع یدین کرتے تھے اور اس عمل کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کرتے تھے۔

سجدوں کے لیے رفع یدین

عن مالك بن الحويرث انه رأى النبى صلى الله عليه وسلم رفع يديه فى صلاته اذا ركع واذا رفع رأسه من الركوع واذا سجدواذا رفع رأسه من السجود حتى يحاذى بهما فروع اذنيه . (رواه النسائى واسناده صحيح وفى الباب عن انسؓ عن ابن عمرعن ابى هريرةؓ (آثار السنن:ص:۱۰۱)

ترجمہ: مالک بن الحویرثؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی نماز میں رکوع کرتے وقت رکوع سے اٹھتے اور سجدے میں جاتے اور سجدے سے اٹھتے وقت رفع یدین کرتے تھے، یہاں تک کہ دونوں ہاتھوں کو کانوں کے اوپری حصہ کے برابر کردیتے تھے۔

قال النيموى: لم يصب من جزم بانه لايثبت شيئ فى رفع اليدين للسجود.ومن ذهب الى نسخه فليس له دليل على ذلك الامثل دليل من قال لايرفع يديه فى غير تكبيرة الافتتاح.(آثار السنن:ص:۱۰۳)

ترجمہ: نیمویؒ کہتے ہیں ان لوگوں کا قول درست نہیں ہے، جو کہتے ہیں کہ سجدوں کے لیے رفع یدین کے سلسلہ میں کوئی روایت ثابت نہیں ہے، اور جو حضرات اس رفع یدین کے منسوخ ہونے کے قائل ہیں ان کے پاس اسی طرح کی دلیل ہے، جس طرح کی دلیل ان حضرات کے پاس ہے، جو کہتے ہیں کہ تکبیر تحریمہ کے علاوہ رفع یدین نہیں کیا جائے گا۔

ابتداء میں ان تمام مواقع پر رفع یدین تھا لیکن بعد میں رکوع اور سجدے اور دو رکعت کے بعد قیام کے سلسلہ میں رفع یدین آیت کریمہ "قوموا للّٰہ قانتین" سے منسوخ ہوگیا۔

اس کی دلیل مسلم شریف کی یہ روایت ہے:

حدثنا ابوبكر بن ابى شيبه وابو كريب قالا نامعاوية عن الاعمش عن المسيب بن رافع عن تميم بن طرفه عن جابر بن سمره قال خرج

علینا رسول اللّٰہ ﷺ فقال مالی اراکم رافعی ایدیکم کانها اذناب خیل شمس اُسکُنوا فی الصلاۃ (الحدیث)(صحیح مسلم:ج:۱، ص:۱۸۱، ابوداؤد :ج:۱،ص:۱۴۳ . نسائی:ج:۱،ص:۱۷۶)

ترجمہ: جابر بن سمرہؓ سے مروی ہے کہ ہمارے پاس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو فرمایا میں تمہیں اس طرح سے ہاتھ اٹھائے ہوئے کیوں پاتا ہوں جیسے بدکے ہوئے گھوڑوں کی دُمیں اٹھی ہوئی ہوں نماز میں سکون اختیار کرو۔

اس حدیث میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف رفع یدین سے منع کر دیا اسی طرح ایک روایت میں جو عن عبید اللّٰہ بن القبطیه عن جابر بن سمرۃؓ ہے سلام پھیرتے وقت ہاتھ اٹھانے کو منع فرمایا ہے اور وہاں وہی تشبیہ دی ہے۔ لیکن تمیم بن طرفہ کی روایت میں خرج علینا رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم کے الفاظ ہیں اور عبید اللہ بن القبطیہ کی روایت میں کنا اذا صلینا مع رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم کے الفاظ ہیں پہلی روایت سے واضح ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس نماز میں شریک نہیں تھے دوسری روایت سے صحابہ کرام کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز میں شریک ہونا ثابت ہوتا ہے بہر حال یہ دونوں حدیثیں الگ الگ ہیں، تشبیہوں کے اشتراک سے حدیثوں کا اشتراک ضروری نہیں۔ حدیث میں اسکنوا فی الصلاۃ کے الفاظ ہیں جس کے معنی نماز کے اندر رفع یدین ترک کرنا۔ چوں کہ تحریمہ کے وقت کا رفع یدین نماز سے قبل ہے اس لیے اس کے علاوہ بقیہ تمام مواقع پر نماز کے اندر رفع یدین ممنوع ہو گیا۔

صدوق رمی بالارجاء بخاری تعلیقا، مسلم ۷

حدثنا هناد نا وکیع عن سفیان عن عاصم بن کلیب عن عبدالرحمن بن الاسود عن علقمه قال قال عبداللّٰہ بن مسعود الا اصلی بکم صلاۃ رسول اللّٰہ ﷺ؟ فصلی بهم فلم یرفع یدیه إلا فی اوّل مرة وفی الباب عن البراء بن عازب قال ابوعیسیٰ حدیث ابن مسعود حدیث حسن وبه یقول غیر واحد من اهلم العلم من اصحاب النبی ﷺ والتابعین وهو قول سفیان واهل الکوفة. (جامع ترمذی:ج:۱،ص:۵۹. رجاله رجال مسلم. قال النیموی رواه الثلاثه وهو حدیث صحیح)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے لوگوں سے کہا میں تم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز نہ

پڑھاؤں؟ پھر انہوں نے نماز پڑھائی اور پہلی دفعہ کے علاوہ پوری نماز میں ہاتھ نہیں اٹھایا۔

عن سالم عن ابیه قال رأیت رسول الله ﷺ اذا افتتح الصلوٰة رفع یدیه حتی یحاذی بهما وقال بعضهم حذو منکبیه واذا اراد ان یرکع وبعد مایرفع رأسه من الرکوع لا یرفعهما وقال بعضهم لایرفع بین السجدتین "والمعنی واحدٌ" (صحیح ابوعوانه: ج:۲، ص:۹۰)

ترجمہ: حضرت سالم اپنے باپ عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ جب آپ ﷺ نماز شروع فرماتے تو رفع یدین کرتے مونڈھوں تک اور جب رکوع کرنے کا ارادہ فرماتے اور رکوع سے سر مبارک اٹھانے کے بعد رفع یدین نہیں فرماتے تھے۔ اور بعض راویوں نے کہا کہ دونوں سجدوں کے درمیان بھی رفع یدین نہیں کرتے تھے، سب راویوں کی روایت کا معنی ایک ہے (مگر الفاظ مختلف ہیں)

اسی طرح تکبیر تحریمہ کے علاوہ اور مواقع میں رفع یدین کے منسوخ ہونے کی اہم ترین دلیل یہ بھی ہے کہ حدیث رفع یدین کے مرکزی اور بنیادی راوی ابن عمرؓ کا عمل بھی ان کی روایت کے خلاف ہے وہ بھی صرف پہلی دفعہ ہی رفع یدین کرتے تھے۔ جو بقیہ مواقع میں رفع یدین کے منسوخ ہونے کی بین دلیل ہے۔ اس لیے کہ ابن عمرؓ جیسے عاشق ادائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس کا تصور بھی محال ہے، کہ وہ جان بوجھ کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی عمل کے خلاف کریں۔ حافظ ابن عبدالبرؒ تحریر فرماتے ہیں:

لانه محال ان یکونُ عنده فی ذٰلك عن النبی ﷺ شیئ ویخالفه ولو کان مباحًا ولا سیما ابن عمرؓ. (التمهید: ج:۹، ص:۱۸۰)

ترجمہ: اس لیے کہ محال ہے کہ ان کے پاس حضور ﷺ کا کوئی عمل ہو اور وہ اس کی مخالفت کریں چاہے وہ عمل مباح ہی ہو خصوصاً ابن عمرؓ سے تو اور بھی بعید ہے۔

ان روایات میں ابن عمرؓ کا عمل دیکھئے:

حدثنا ابوبکر بن عیاش عن حصین عن مجاهد قال مارأیت ابن عمرؓ یرفع یدیه الافی اوّل مایفتتح. (مصنف ابن ابی شیبه: ج:۱، ص:۲۶۸، رجال اسناده رجال البخاری)

ترجمہ: مجاہد فرماتے ہیں کہ میں نے ابن عمرؓ کو اوّل افتتاح کے علاوہ ہاتھ اٹھاتے ہوئے نہیں دیکھا۔

عن مجاهد قال صليت خلف ابن عمرؓ فلم يكن يرفع يديه الا في التكبيرة الاولىٰ. (شرح معاني الآثار: ج:۱، ص:۱۳۳، وقال العيني اسناده صحيح. عمدة القاري: ج:۵، ص:۲۷۳)

ترجمہ: مجاہدؒ کہتے ہیں کہ میں نے ابن عمرؓ کے ساتھ نماز پڑھی وہ تکبیر اولیٰ کے علاوہ ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے۔

اسی طرح خلفائے راشدین میں حضرت ابوبکر حضرت عمر حضرت علی رضوان اللہ علیہم اجمعین کا عمل صحیح سندوں سے یہی ثابت ہے کہ وہ صرف تکبیر اولیٰ میں رفع یدین کرتے تھے خلفائے راشدین سے بڑھ کر حضور ﷺ کے عمل کو کون جاننے والا اور دیکھنے والا اور اس پر عمل کرنے والا ہو سکتا ہے۔

قال النيمويؒ: الصحابة رضى الله عنهم ومن بعدهم مختلفون فى هذا الباب واما الخلفاء الاربعة فلم يثبت عنهم رفع الايدى فى غير تكبيرة الاحرام. (والله اعلم بالصواب) (آثار السنن: ج:۱، ص:۱۰۹)

ترجمہ: نیمویؒ نے کہا کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور ان کے بعد والے اس باب میں اختلاف رکھتے ہیں لیکن خلفائے راشدینؓ سے تکبیر تحریمہ کے علاوہ رفع یدین ثابت نہیں ہے۔

تعامل خلفائے راشدین بہت بڑی دلیل ہے۔ اس کے برخلاف غیر مقلد حضرات کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل اخیر تک رہا۔ کبھی منسوخ نہیں ہوا۔ اور اس سلسلہ میں جس حدیث سے استدلال کرتے وہ بالکل موضوع ہے۔ وہ حدیث یہ ہے:

عن ابن عمرؓ ان رسول الله ﷺ كان اذا فتتح الصلوٰة رفع يديه، واذاركع واذا رفع رأسه من الركوع وكان لايفعل ذلك فى السجودفما زالت تلك صلواته حتى لقى الله تعالىٰ (رواه البيقهى وهو حديث ضعيف بل موضوع) (آثار السنن: ص:۱۰۱، ج:۱)

ترجمہ: ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ جب نماز شروع فرماتے اور جب رکوع کرتے اور رکوع سے سر اٹھاتے تو رفع یدین کرتے اور سجدے میں یہ عمل نہیں فرماتے تھے۔ آپؐ کی اللہ تعالیٰ کے یہاں جانے تک اسی طرح نماز رہی۔

اس حدیث کے راویوں میں عبدالرحمٰن بن قریش اور عصمۃ بن محمد الانصاری ہیں اور یہ دونوں راوی وضّاع اور کذاب ہیں۔ (ملاحظہ ہو نصب الرایہ: ص:۴۱۰، ج:۱)

عجیب جسارت ہے کہ اپنے مطلب کی بات کے لیے موضوع روایتوں کا سہارا لینے سے بھی پاک نہیں ہے اور اپنے مطلب کے خلاف ہو تو صحیح روایتوں کو بھی ضعیف کہہ دینے میں کوئی خوف نہیں ہوتا یہ کس قدر عبرت کا مقام ہے کہ ایک صاحب نے اس موضوع حدیث کی جھوٹے راویوں والی سند ہٹا کر بخاریؒ و مسلمؒ کی سند لگا دی بد دیانتی خیانت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر پورے منصوبہ بندی کے ساتھ جھوٹ باندھنے کی اس سے بھیانک مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔

چنانچہ مولوی نور حسین گرجاکھی غیر مقلد لکھتے ہیں:

''رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا وفات تک رفع یدین کرنا''

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یرفع یدیہ اذا افتتح الصلاۃ واذا کبر للرکوع واذا رفع راسہ من الرکوع فمازالت تلک صلاتہ حتی لقی اللہ تعالیٰ.

سبحان اللہ یہ کیسی پیاری اور عمدہ حدیث ہے جس کو چھیالیس ائمہ نے نقل کیا ہے، اور اس کا اسناد کتنا عمدہ۔ (۱) امام مالک تو وہ تمام عالموں اور محدثوں کے پیشوا ہیں اور وہ اس کو (۲) ابن شہاب زہریؒ سے روایت کرتے ہیں کہ جو اہل مدینہ کے بڑے مشہور عالم اور امام تھے اور امام زہری (۳) سالم ابن عبداللہ سے روایت کرتے ہیں جو بڑے تابعی اور فقیہ ہیں، اور سالم حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت کرتے ہیں کہ جو بڑے قدیم الاسلام متبع سنت اور بڑے درجے والے ہیں۔ (قرۃ العینین فی اثبات رفع الیدین: ص:۹۰۸)

جن لوگوں کے نزدیک رفع یدین ترک ہوا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ افضلیت ترک ہوئی اصل جواز باقی ہے اور دوسروں کے نزدیک افضلیت باقی ہے اسے واجب تو کسی نے نہیں کہا اور نہ ہی وہ کبھی واجب رہا۔ کسی ضعیف سے ضعیف روایت سے بھی واجب نہیں ثابت کیا جا سکتا ہے۔

لیکن مولوی نور حسین گرجاکھی اپنے فرقہ کی ترجمانی کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''رفع یدین سنت مؤکدہ بلکہ واجب ہے اور اس کے چھوڑنے سے نماز باطل ہو جاتی ہے۔

(قرۃ العینین: ص:۶۹)

غیر مقلدین کے مناظر اسلام عبدالقادر صاحب رو پڑی فرماتے ہیں۔

''جو شخص اس سنت کا تارک ہو وہ سخت گنہگار ہے''۔ (بحوالہ حدیث اور اہل حدیث: ص:۴۳۶)

اہل نظر ذرا غور فرمائیں! کہ ان لوگوں کے ان بے محابا فتوؤں کی زد میں کون کون آ رہا ہے کیوں کہ خلفائے ثلاثہ (چوں کہ حضرت عثمانؓ سے رفع اور عدم رفع کچھ بھی منقول نہیں ہے)

اور عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت براء بن عازبؓ حضرت عبادؓ اور بے شمار صحابہ کرامؓ فقہائے کوفہ۔ اور تمام عالم کے بیشتر مسلمان رفع یدین نہیں کرتے تو سب کی نمازیں معاذ اللہ باطل ہوئیں سب تارک سنت اور سخت گناہ گار ہوئے۔ ع

ناوک نے ترے صید نہ چھوڑا زمانے میں

نماز وتر واجب ہے

(۱) عن عبداللّٰه بن عمرؓ عن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم قال اجعلوا آخر صلواتکم باللیل وتراً. (بخاری شریف: ص:۱۳۶، ج:۱، مسلم شریف: ج:۱، ص:۲۵۷)

ترجمہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اپنی رات کی نمازوں کے آخر کو وتر بناؤ۔

(۲) وعنه ان النبی صلی اللّٰه علیه وسلم قال: بادرُوا الصبح بالوتر. (مسلم شریف: ج:۱، ص:۲۵۷)

ترجمہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے صبح سے پہلے وتر پڑھ لو!

(۳) عن جابرؓ قال: قال: رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم من خاف ان لایقوم من آخر اللیل، فلیوتر اوّله ومن طمع ان یقوم آخره، فلیوتر آخر اللیل -فان صلوٰة آخر اللیل مشهودة-وذٰلك افضل. (مسلم شریف: ص:۲۵۸۔ ج:۱)

ترجمہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص کو یہ ڈر ہو کہ وہ آخرِ شب میں نہیں اٹھ سکتا تو اسے چاہیے کہ رات کے شروع ہی میں وتر پڑھ لے۔ اور جسے آخر شب میں اٹھنے کی امید ہو تو اسے چاہیے کہ آخر شب میں ہی وتر پڑھے۔ اس لیے کہ آخر شب کی نماز ملائکہ رحمت کے نزول کا وقت ہے اور یہ افضل وقت ہے۔

(۴) عن بُرَیدَةؓ قال: سمعت رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یقول: الوتر حقٍ. فمن لم یوتر فلیس منا- الوتر حق. فمن لم یوتر فلیس منا-

الوتر حق. فمن لم یوتر فلیس منا. (ابوداؤد شریف: ج:۱،ص:۲۰۱۔ وقال الہیثمی اسنادہ حسن)

ترجمہ: حضرت بریدہؓ کہتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے ہوئے سنا کہ وتر حق ہے جو وتر نہ پڑھے وہ ہم میں سے نہیں (اس بات کو آپ ﷺ نے تین دفعہ ارشاد فرمایا)

(۵) وعن ابی سعید نالخدریؓ قال: قال: رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اِنَّ اللّٰہ زادکم صلوٰۃ، وھی الوتر. (رواہ البطرانی فی مسند الشامیین قال الحافظ فی الدرایۃ باسناد حسن الدرایۃ، ص: ۱۸۹، ج: ۱، کتاب الصلوٰۃ)

ترجمہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے ایک اور نماز بڑھادی ہے اور وہ وتر ہے۔

ان احادیث اور ان کے علاوہ اور بہت سی احادیث کے پیش نظر امت کے بہت سے علماء (جن میں صحابہ کرامؓ مثلاً حضرت ابن مسعودؓ حضرت حذیفہؓ اور تابعین عظامؒ مثلاً ابراہیم نخعیؒ اور سعید ابن مسیبؒ وغیرہ شامل ہیں) وتر کے واجب ہونے کے قائل ہیں۔ اور یہی رائے امام ابوحنیفہؒ کی بھی ہے۔ (ملاحظہ ہو: آثار السنن مع التعلیق الحسن: ص: ۲۹۹، ۳۰۰، ج:۱، مکتبہ مدنیہ دیوبند)

معارف السنن میں ہے:

ومن الادلۃ انہ لم یثبت انہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ترک الوتر حضرًا. ولا سفراً، بل لم یثبت ذٰلک من الصحابۃ والتابعین، وھذا القدر یکفی دلیلاً للوجوب وقال مالک: من ترکہ ادب وکانت جرحۃ فی شھادتہ ❁ حکاہ ابن حزم عنہ کما فی العمدۃ.

(ص: ۴۱۲، ج: ۳) (معارف السنن: ص: ۱۷۸، ج: ۴)

ترجمہ: وتر کے وجوب کے دلائل میں سے یہ بھی ہے، کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا سفر اور حضر کسی بھی حالت میں وتر کا ترک کرنا ثابت نہیں ہے بلکہ صحابہ کرامؓ اور تابعین عظامؒ سے بھی وتر کا ترک کرنا ثابت نہیں ہے اور یہ چیز وجوب کی دلیل کے لیے کافی ہے۔ حضرت امام مالکؒ نے کہا ہے کہ جو وتر ترک کرے گا۔ اس کی سرزنش کی جائے گی اور یہ چیز اس کی شہادت مجروح کردے گی۔ ان کی اس بات کو علامہ ابن حزمؒ نے نقل کیا ہے جیسا کہ عمدۃ القاری میں لکھا ہے۔

لیکن نصوص کی ان تاکیدوں اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام

رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اس شدتِ اہتمام کے باوجود غیر مقلدین کا کہنا ہے کہ وتر واجب نہیں ہے۔ جناب نواب نورالحسن خاں صاحب لکھتے ہیں:

''وتر حق است بر ہر مسلم، لیکن واجب نیست۔ معہذا قضاء آں ثابت است''۔

ترجمہ: وتر حق ہے ہر مسلمان پر لیکن واجب نہیں۔ ہاں اس کی قضا ثابت ہے۔

وتر کی تین رکعتیں ایک ہی سلام سے ثابت ہیں

مذکورہ بالا احادیث سے واضح ہوا کہ جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہِ مبارک میں نماز وتر کی بڑی اہمیت تھی۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا بڑا اہتمام تھا۔ باوجودیکہ وتر کا افضل وقت رات کا آخری حصہ ہے لیکن بیدار نہ ہو سکنے کی وجہ سے کہ کہیں یہ نماز فوت نہ ہو جائے اس صورت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ حکم دیتے تھے کہ نماز عشاء کے بعد ہی وتر پڑھ لی جائے جیسا کہ حضرت جابرؓ سے مروی مسلم شریف کی روایت میں یہ حکم موجود ہے۔ اور یہی حکم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوہریرہؓ حضرت ابوالدرداء حضرت ابوذرؓ کو دیا تھا (جیسا کہ بخاری مسلم اور نسائی میں علی الترتیب روایتیں موجود ہیں)

چنانچہ کسی عذر کی بناء پر کبھی کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی رات کے شروع یا درمیان میں نماز وتر پڑھ لیتے تھے۔ ورنہ عام طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم وتر رات کے آخری حصہ میں تہجد کے بعد ہی پڑھتے تھے جیسا کہ ترمذی شریف میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے:

''من کل لیل قداوتر. اولہ، واو سطہ، و آخرہ، فانتھی وترہ حین مات فی وجہ السحر'' (ترمذی شریف: مع معارف السنن: ص:۱۸۴، ج:۴)

ترجمہ: حضور اکرم صلی اللہ علیہ سلم نے رات کے اوّل درمیانی اور آخری تمام حصوں میں نماز وتر پڑھی اور وصال کے قریب تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وتر آخر شب میں ہی ہوتی تھی۔

نماز وتر کے سلسلہ میں وارد تمام احادیث پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے، کہ جن صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس وتر کو بیان کیا، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عشاء کے بعد پڑھی تو ان حضرات نے رکعتوں کی تعداد تین اور تینوں ایک ہی سلام سے بیان کی ہے (جیسا کہ آئندہ صفحات میں انشاء اللہ ہم ان روایتوں کو ذکر کریں گے)

اور جن حضرات ؓ نے آخرِ شب میں وتر پڑھنے کی روایتیں بیان کی ہیں، تو ان حضرات نے تہجد اور وتر دونوں پر تغلیباً وتر ہی کا اطلاق کر دیا ہے، اور تہجد کو وتر کے ساتھ شامل کر کے دونوں کی رکعتوں کو ایک ہی ساتھ بیان کر دیا ہے چوں کہ تہجد کی رکعات متعین نہیں ہیں اس لیے وہ حضرات کبھی پانچ کبھی سات، کبھی نو کبھی گیارہ، اور کبھی تیرہ بیان کر دیتے ہیں۔ اور اس کی حقیقت یہی ہوتی ہے کہ آخر کی تین وتر اور پہلے کی سب تہجد ہوتی ہیں۔ حضرت امام ترمذیؒ فرماتے ہیں۔

وقد روی عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم "الوتر بثلاث عشرة، واحدی عشرة، وتسع سبع، وخمس، وثلاث، وواحدة قال اسحاق بن ابراهیم معنی ماروی "ان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم کان یوتر بثلاث عشرة" انما معناه انه کا یُصَلّی من اللیل ثلاث عشرة رکعة مع الوتر فنسبت صلوٰة اللیل الی الوتر".

(ترمذی مع معارف السنن: ص:۸۶-۱۸۵، ج:۴)

ترجمہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے وتر تیرہ، اگیارہ، نو، سات، پانچ تین اور ایک رکعتیں مروی ہیں۔ اسحاق بن ابراہیم کہتے ہیں کہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تیرہ رکعات وتر پڑھنا مروی ہے۔ تو اسکا معنی یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم رات میں وتر سمیت تیرہ رکعات پڑھتے تھے تو تہجد کو بھی وتر کے ساتھ شامل کر دیا گیا۔

اسحاق ابن ابراہیمؒ نے جو توجیہ تیرہ رکعات کے سلسلے میں بیان کی ہے وہی توجیہ اگیارہ، نو، سات اور پانچ رکعات کے بارے میں بھی کی جائے گی۔ صحیح مسلم میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے:

"انبئینی عن وتر رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فقالت: کنا نعدّله سوا که وطهوره فیبعثه اللّٰہ ماشاء ان یبعثهٗ من اللیل فیتسوّك ویتوضأ ویصلی تسع رکعات- لایجلس فیها إلا فی الثامنة- فیذکر اللّٰہ ویدعوه ویحمدهٗ ثم ینهض ولا یُسلم ثم یقوم فیصلی التاسعة ثم یقعد فیذکر اللّٰہ ویحمدهٗ ویدعوه ثم یسلم تسلیماً. (باب صلوٰة اللیل: ص:۲۵۶-ج:۱)

ترجمہ: راوی نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا، کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وتر کے بارے میں ہمیں مطلع فرمائیں۔ تو انھوں نے فرمایا: کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مسواک اور وضو کا پانی تیار

رکھتے تھے۔ پھر جب اللہ کی مرضی ہوتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیدار ہوتے تھے، اور مسواک اور وضو سے فارغ ہوکر نو رکعتیں پڑھتے تھے، جس میں صرف آٹھویں رکعت میں قعدہ فرماتے تھے۔ پھر اللہ کے ذکر حمد اور دعا کے بعد بغیر سلام پھیرے اٹھتے تھے اور نویں رکعت پڑھتے تھے پھر قعدہ فرما کر اللہ کا ذکر حمد اور دعا کرتے اور اس کے بعد سلام پھیرتے تھے اس حدیث کی واضح تشریح یہی ہے کہ اس میں ابتداء کی چھ رکعتیں تہجد ہیں اور آخر کی تین وتر ہیں۔ جن میں ابتداء کی دو رکعتوں کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قعدہ تو فرمایا لیکن سلام نہیں پھیرا۔ اور آخری رکعت پر سلام پھیرا۔ چوں کہ سائل نے ان سے تہجد کی تفصیلات نہیں دریافت کی تھی اس لیے حضرت عائشہؓ نے اس کی تفصیل نہیں ذکر فرمائی۔ رہا ساری رکعتوں پر وتر کا اطلاق تو یہ تغلیباً ہے جیسا کہ اس کا بیان گذر چکا ہے۔

علامہ بدرالدین عینیؒ اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"هذا اقتصار منها على بيان جلوس الوتر وسلامه. لان السائل انما سأل عن حقيقة الوتر ولم يسأل عن غيره فاجابت مُبيِّنَةً بما في الوتر من الجلوس على الثانية بدون سلام والجلوس على الثالثة بسلام. وهذا عين مذهب ابي حنيفة. وسكتت عن جلوس الركعات التي قبلها وعن السلام فيها كما ان السوال لم يقع عنها فجوا بها قدطابق السوال، غير انها اطلقت على الجميع وتراً في الصورتين لكون الوتر فيها. (عمدۃ القاری: ص: ۳۰۸-۳۰۹، ج: ۳، بحوالہ معارف السنن: ص: ۱۱۸، ج: ۴)

ترجمہ: اس حدیث میں حضرت عائشہؓ نے وتر کے جلوس اور سلام کے بیان پر اکتفاء کیا اس لیے کہ سائل نے وتر ہی کی حقیقت کے بارے میں سوال کیا تھا۔ تو انھوں نے وتر کی دوسری رکعت کے جلوس بغیر سلام اور تیسری رکعت کے جلوس اور سلام کو بیان کیا۔ یہی بعینہٖ امام ابوحنیفہؒ کا مسلک ہے۔ اور انھوں نے وتر کے قبل کی رکعات کے جلوس کا کوئی ذکر نہیں کیا اس لیے کہ اس کے بارے میں سوال ہی نہیں تھا۔ تو ان کا جواب سوال کے مطابق ہے۔ مگر انھوں نے ساری رکعتوں پر صورتاً وتر کا لفظ اطلاق فرمایا کیوں کہ ان میں وتر داخل تھی۔

علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ نے فرمایا کہ علامہ عینیؒ کی توجیح صحیح ہے امام طحاویؒ نے بھی شرح معانی الآثار میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ حضرت عائشہؓ کی یہی روایت امام نسائیؒ نے ذکر کی ہے۔

جس کے الفاظ یہ ہیں:

"عن عائشةؓ ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کان لایسلم فی رکعتی الوتر"

ترجمہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم وتر کی دو رکعتوں میں سلام نہیں پھیرتے تھے۔ (سنن النسائی باب کیف الوتر بسلام: ص:۲۴۸، ج:۱)

اس حدیث کے بارے میں علامہ کشمیریؒ فرماتے ہیں "سند الحدیث فی غایة القوة"

ترجمہ: اس حدیث کی سند انتہائی قوی ہے۔ (تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو معارف السنن: ص:۱۸۸، ج:۴)

اس حدیث سے علامہ عینیؒ وغیرہ کی تشریح اظہر من الشمس ہوگئی اور چوں کہ آخری رکعت سابقہ رکعات سے الگ انداز پر ہوتی ہے اس لیے بعض دفعہ مجازاً صرف اسی پر وتر کا اطلاق کر دیتے ہیں جیسا کہ ابن عباسؓ کی اس روایت سے اِس بات کی وضاحت ہوتی ہے فرماتے ہیں:

"ثم رکعتین ثم اوتر" (بحوالہ: معارف السنن: ص:۲۱۶، ج:۱)

پورے ذخیرہ احادیث میں کسی بھی روایت سے صراحتاً نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا صرف ایک رکعت وتر پڑھنا ثابت نہیں ہے۔ ابن صلاحؒ فرماتے ہیں:

لانعلم فی روایات الوتر مع کثرتها انه علیه السلام اوتر بواحدة فحسب" (حکاه ابن الحجر فی التلخیص :ص:۱۱۶. بحواله معارف السنن :ص:۲۱۵. ج:۲)

ترجمہ: وتر کی روایات کی کثرت کے باوجود ہمیں یہ نہیں معلوم ہوسکا، کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ایک ہی رکعت وتر پڑھی ہو۔

صحیحین وغیرہ میں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ:

"صلی رکعة واحدة توتر له ماقد صلی"

ترجمہ: ایک رکعت پڑھے جو گذشتہ رکعتوں کو وتر بنا دے گی۔

اس سے صاف واضح ہوتا ہے وہ رکعت تنہا وتر نہیں ہے۔ ہاں وہ اپنی ماقبل کی رکعتوں سمیت وتر بن جائے گی۔ علامہ نیمویؒ فرماتے ہیں:

"فیحتمل ان یرید بقوله صلی رکعة واحدة ای مضافة الی رکعتین

مما مضیٰ. (التعلیق الحسن: ص: ۳۰۷. ج: ۱)

ترجمہ: یہ بھی احتمال ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول مبارک "صلی رکعة واحدة" سے مراد یہ ہو کہ وہ اپنے ماقبل کی دو رکعتوں سے ملی ہوئی ہو۔ بلکہ تین رکعات والی روایتوں سے اسی معنی کی صراحتاً تاکید ہوتی ہے۔ ایک رکعت وتر کی نفی اور تین رکعت کا ثبوت۔ بیہقی وغیرہ کی اس روایت سے بخوبی ہوتا ہے:

عن ابی هريرةؓ عن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: لا توتروا بثلاث اَوْ تِروا بخمس، اوبسبع. ولاتشبّهوا بصلوٰة المغرب.

(دار قطنی: ج: ۲، ص: ۲٤. سنن الکبری للبیهقی: ج: ۳، ص: ۳۱. اسنادہ حسنٌ)

ترجمہ: جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تین رکعت کے ذریعہ وتر نہ پڑھو بلکہ پانچ یا سات رکعات کے ذریعہ وتر پڑھو اور مغرب کی نماز کے ساتھ مشابہت مت اختیار کرو۔

یہ حدیث اس سلسلہ میں واضح ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذہن مبارک میں وتر تین ہی رکعت ہے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے ہیں کہ لوگ صرف وتر پر اکتفاء کر کے اسے مغرب کی طرح نہ بنادیں بلکہ اس سے پہلے دو چار رکعت تہجد بھی پڑھ لیا کریں۔

علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ فرماتے ہیں:

"ان الحديث يدل على ان لاوتر هناك فى ذهن الشارع اقل من ثلاث، وانه يُريدان لايقتصروا عليه فيتركوا صلوٰة الليل رأسًا. (معارف السنن: ص: ۳۲۱. ج: ۴)

ترجمہ: یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ نبی کریم ﷺ کے ذہن مبارک میں یہی ہے کہ وتر تین رکعات سے کم نہیں ہے لیکن آپ ﷺ چاہتے ہیں کہ لوگ اسی پر اکتفاء کر کے تہجد ترک نہ کر دیں۔

نیز یہ حدیث ایک رکعت وتر کی نفی کرتی ہے:

"فى ذلك نفى الايتار بركعة واحدة" (تقریب شرح معانی الآثار: ج: ۱، ص: ۲۷۳)

ترجمہ: اس حدیث میں ایک رکعت وتر کی نفی ہے۔

اب یہاں ہم چند روایات ذکر کرتے ہیں جن سے صراحۃً وتر کی تین رکعات کا ایک سلام سے ثبوت ہوتا ہے۔

(۱) "عن ابی سلمة بن عبدالرحمن انه اخبرهٗ انه سأل عائشةؓ كيف كانت صلوٰة رسول الله صلى الله عليه وسلم فى رمضان؟ فقالت:

ماکان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یزید فی رمضان ولا فی غیرہ علی احدی عشر رکعۃ یصلی اربعًا فلا تسئل عن حسنھن وطولھن، ثم یصلی اربعًا فلا تسئل عن حسنھن وطولھن ثم یصلی ثلاثًا.

(بخاری: ص: ۱۵۴. ج: ۱. مسلم: ص: ۲۵۴. ج: ۱)

ترجمہ: ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے حضرت عائشہؓ سے دریافت کیا کہ رمضان المبارک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کیسی ہوتی تھی؟ حضرت عائشہؓ نے جواب دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان اور غیر رمضان میں گیارہ رکعتوں سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے۔ پہلے چار رکعتیں پڑھتے تھے۔ نہ پوچھو! کہ وہ کتنی حسین وطویل ہوتی تھیں۔ پھر چار رکعتیں پڑھتے تھے ان کے بھی حسین وطویل ہونے کے بارے میں کچھ نہ پوچھو! پھر تین رکعت وتر پڑھتے تھے۔

(۲) عن سعد بن ھشام ان عائشۃؓ حدثتہ ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ وسلم کان لایسلم فی رکعتی الوتر. (رواہ النسائی: ج: ۱، ص: ۲۴۸ و آخرون واسنادہ صحیح)

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وتر کی پہلی دو رکعتوں میں سلام نہیں پھیرتے تھے۔

(۳) روی عن ابن عباسؓ حدیث طویل فی آخرہ ثم اوتر بثلاث"

(مسلم: ص: ۲۶۱. ج: ۱)

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ کی طویل حدیث کے آخیر میں ہے پھر نبی کریم ﷺ نے تین رکعات وتر پڑھی۔

عن عائشۃؓ قالت: کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یوتر بثلاث لایُسلم الافی آخرھن. (رواہ الحاکم فی المستدرک: ص: ۳۰۴. ج: ۱. وقال انہ صحیحٌ علی شرط البخاری ومسلم)

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تین رکعات وتر پڑھتے تھے اور آخر ہی میں سلام پھیرتے تھے۔

نبی کریم ﷺ سے ایک ہی سلام کے ذریعہ وتر کی تینوں رکعتیں پڑھنے کے اس صاف اور صریح ثبوت کے بعد غیر مقلدوں کی یہ جسارت بے جا دیکھیے! نواب نورالحسن خاں صاحب لکھتے ہیں:

"حدیث ایتار بسہ رکعت ضعیف بلکہ غیر ثابت است بلکہ ازاں نہی آمدہ است پس احتیاط

در ترک ایتار بسہ رکعت ست"۔ (عرف الجادی: ص: ۳۳)

ترجمہ: تین رکعات وتر پڑھنے کی حدیث ضعیف ہے بلکہ ثابت نہیں ہے۔ بلکہ اس سے ممانعت آئی ہے پس احتیاط اس میں ہے کہ تین رکعات نہ پڑھیں۔ نواب وحید الزماں صاحب لکھتے ہیں:

"اما الوتر بثلاث رکعات مع تشهدين وسلام واحدٍ. كما هو مذهب الاحناف منهي عنه لئلا يتشبه النفل بالفرض. اى صلاة المغرب.

ترجمہ: رہیں تین رکعات وتر۔ دو تشہدوں اور ایک سلام کے ساتھ۔ جیسا کہ احناف کا مذہب ہے۔ تو اس سے منع کیا گیا ہے تا کہ نفل فرض یعنی مغرب کے مشابہ نہ ہو جائے۔ صحیح اور صریح روایات سے ثابت شدہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عمل مبارک کو "منہی عنہ" یعنی حرام قرار دینے کو جسارت اور جہالت کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے؟
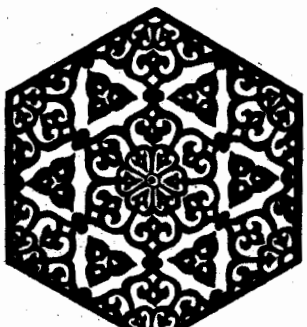
اللّٰھم احفظنا من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا